
P. 25
32
35
41
215
59
63

حیاتِ سعدی

حالی

The best book

Good book

سب سے اچھی کتاب

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً وَّاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا

حیاتِ سعدی

یعنی

شیخ سعدی شیرازی (رحمۃ اللہ علیہ) کی سوانحعمری اور اُن کی تصنیفات

نظم و نثر پر ریویو

مُرتّبہ

جناب شمس العُلماء مولوی الطاف حسین متخلّص بہ حالی مرحوم

جسے

شیخ مُبارک علی تاجر کُتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

نے

سنہ ۱۹۳۸ء

قیمت .... ایک روپیہ چار آنہ عہ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگرفی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں کم و بیش قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اُس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کئے جاتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگذشتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اِس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگرافر پلوٹارک کی بیوگرفی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ اُس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے۔ اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں اُس زمانے کے اولیاء شہدا اور مجتہدوں کی سوانحعمری جو کسی قدر مکمّل ہیں۔ کثرت سے موجود ہیں۔ زمانہ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگرفی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے۔ لیکن اِن دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے۔ ورایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگرفی میں بھی یہی عام

خاصیت پائی جاتی ہے۔صرف رجال حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں۔اُن میں البتّہ بہت احتیاط کی گئی ہے ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں۔باقی علما اور شعرا وغیرہ کے تذکرے اکثر ایسے نہیں ہیں۔اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا اس لئے اُن لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصّل لکھے گئے ہیں جیسے خلفا، سلاطین، وزرا اور سپہ سالار وغیرہ، باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں۔اور مشہور سے مشہور مصنّف کی لائف بھی جُداگانہ نہیں لکھی گئی۔زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترھویں صدی سے بیوگرفی کو بے انتہا ترقّی دی ہے۔یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرفی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔حال کی بیوگرفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کئے جاتے ہیں مصنّف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہیں۔

بیوگرفی اُن بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے۔جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دُنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزّل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں۔اُن کے لئے بیوگرفی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور اُنکے کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے۔اور اپنی کھوئی ہوئی

عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلےٰ درجہ تک پہنچایا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ لوتھر[۱] کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن[۲] فرینکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقّی اور شہرت حاصل کی اُس کا بڑا سبب یہی بیوگرفی کا مطالعہ تھا۔ بیوگرفی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرفی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنیکا شوق دامنگیر ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنّف کا قول ہے کہ "بیوگرفی چلاّ چلاّ کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غُل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو" ہمارے ملک میں بیوگرفی کی طرف ابتک کچھ توجہ نہیں ہوئی مُلک کی عام زبان یعنی اُردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں۔ جن کے حالات پڑھکر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور اُن کے کمالات قوم کیلئے

۱؎ لوتھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے پنجہ سے نجات دینے والا ہے۔ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۵۴۶ء میں فوت ہوا۔

۲؎ یہ شخص امریکہ کا ایک مشہور فاضل ہے جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کئے ہیں ۱۷۰۶ء میں بمقام بوسٹن پیدا ہوا اور ۱۷۹۰ء میں فوت ہوا۔

سرمایہ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ اُن کا نام زندہ کرنے اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لئے اُن کے فضائل اور کمالات دُنیا میں شائع کریں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قدما میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں اُن کے بھی مفصّل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے۔ لیکن اُس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں۔

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے شاید اُنکے مفصّل حالات بہم پہنچ جائیں۔ اُن کی سوانحمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور انگریزی تذکرہ سر گور اوسلی[۱] صاحب کا بھی دیکھا مگر ان تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکائتیں جو زبان زد خاص و عام ہیں تھوڑے تھوڑے تفاوت کیساتھ مندرج پائیں۔ شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اُس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنیوالی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادہ کو جس طرح ہو سکا پورا کیا۔ جسقدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہو سکتی تھیں اُن کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کئے۔ اور نیز اُس عہد کی تاریخ میں اکثر واقعات کا سُراغ لگایا اور کچھ باتیں علی بن احمد جامع کلیات شیخ کے دیباچہ سے اخذ کیں۔ اور کچھ

[۱] یہ صاحب ۱۸۱۱ء میں جبکہ مارکوئس آف ولزلی صاحب گورنر جنرل تھے بطریق سیاحت ہندوستان میں آئے تھے۔ شدہ شدہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں نوکر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر ہو کر گئے۔ سفارت کے زمانہ میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے انہوں نے بہت کوششوں سے لکھا تھا ❊

کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی۔ اور اس تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا لائف کی صورت میں مرتّب کیا۔ اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تفحص پر بھروسہ کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا۔ اگرچہ شیخ کی اصل سرگذشت میں جسقدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے، کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے لیکن جس ترتیب کیساتھ اُسکے پراگندہ حالات جمع کر کے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقہ سے اُسکی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لئے اسکا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اور خاصکر شعرا کو اُس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی۔

اس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اُسکی تصنیفات کا مفصّل ذکر ہے اور خاتمہ میں اُسکے عام حالات اور عام شاعری پر بالاجمال نظر کی گئی ہے۔ اگرچہ اسلام کے قدیم مصنّفوں میں بے شمار لوگ ایسے گذرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رُتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اوّل شیخ کا حال اس لئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنّف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاصکر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اُس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانہ نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنّفوں کی سوانحعمری اور اُن کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے +

اَلسَّعیُ مِنِّی وَالاِتمامُ مِنَ اللّٰہِ ۵

پہلا باب

شیخ کی سوانح عُمری

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اُس مردم خیز خطّہ کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنّف پیدا ہُوا۔ اور جہاں سے علماء وشعرا اور جلیل القدر مصنّفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقہ اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے ؛

فارس اور شیراز کا حال

ایران کے جنوب مغربی حصّہ میں خلیج فارس کے کنارہ پر پارس ایک خطّہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص اِس حصّہ کو پارس کہا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور

لہ پارس جیسا کہ فرہنگ ناصری میں لکھا ہے ہوشنگ کے بیٹے کا نام تھا۔ اُسی کے نام سے قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہل یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لئے پرشیا یعنی پارس کہتے ہیں۔ لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبہ اور ولایت کا جدا جدا نام رکھا گیا اُسوقت سے پارس اِس خاص ولایت کو کہنے لگے ؛

قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اُس کو دُنیا کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے۔ اور جنوبی حد پر سمندر یعنی خلیج فارس ہے آب و ہوا کہیں نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے۔ اکثر صحرا سرسبز وشاداب ہیں۔ جا بجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں۔ صحرائے شاپور میں جو کہ شیراز کے نواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے جس کا نام شعب بوّان ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا میں چار تفرّج گاہیں ایسی ہیں جن کا کہیں نظیر نہیں۔ صغد سمرقند۔ غوطۂ دمشق۔ نہر اُبلہ اور شعب بوّان اتابک ابو بکر بن سعد زنگی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گلستان لکھی ہے ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لئے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ شعب بوّان۔ اکثر شعرائے عرب نے اس قطعہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضد الدولہ دیلمی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

اِذَا اَشْرَفَ الْمَحْزُوْنُ مِنْ رَاْسِ قَلْعَۃٍ	عَلٰی شِعْبِ بَوَّانَ اسْتَرَاحَ مِنَ الْکَرْبِ

ترجمہ۔ جب غمگین آدمی قلعہ پر سے شعب بوّان کی فضا کو دیکھتا ہے تو اُس کی تمام کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں ؛

فارس کے میوے عراق عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے و مفید کانیں فارس

ـــه صغد معرّب صغد و نشیب کی زمین اور صغد سمرقند ایک نزہت گاہ سمندر کے قریب تھی غوطہ بھی نشیب کی زمین کہتے ہیں۔ اور غوطہ دمشق کی ایک سیرگاہ دمشق میں تھی۔ اُبلہ بصرہ میں ایک پُر فضا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی اُس کو نہر اُبلہ کہتے تھے۔ یہ تینوں مقام اور شعب بوان دُنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے ؛

ہیں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دُنیا کے اُن عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانہ کے لوگ جنّ اور پری کے کام سمجھتے تھے۔ جیسے تخت جمشید۔ نقش شاپور۔ دخمہ فریدون۔ اور خانہ زردشت ان کا مفصّل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے۔ انہی آثار قدیمہ کی نسبت عُرفی شیرازی نے کہا ہے ؎

از نقش و نگار درو دیوار شکستہ	آثار پدید است صنا دید عجم را

اِس کے سوا اور بہت سی خصوصیّتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ جیسے یزد دیبند۔ گازرون۔ فیروز آباد۔ بیضا۔ شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علما و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جن کی تصنیفات مسلمانوں میں ابتک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پائے تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو دار المومنین اور یزد کو دار العباد کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو دار العلم کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و فضل زمانہ کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تنزّل سے اب نہایت پست حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشہ میں اب تک بدمست ہیں۔ حاجی لُطف علی خاں آذر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بُوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسب معاش اسقدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں اور ہمیشہ سیر گاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانہ میں پڑی ہے محمدؐ بن قاسم جس نے مسلمانوں

ہیں سب سے اوّل ہندوستان پر لشکر کشی کی ہے۔ شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز و شاداب قطعہ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ "شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پُر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو" پھر صفاریون[1] اور دیلمیون[2] کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ میں اُس کی آبادی اس درجہ کو پہنچی کہ شہر میں اہل لشکر کی گنجائش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام سوق الامیر رکھا گیا اور اُس کے بیٹے صمصام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پُختہ فصیل کھچوائی۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پُرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ازانجملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت	کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ را

شیخ علی حزین نے بارھویں صدی ہجری میں جبکہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی اُس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانحعمری میں اس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ "شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے جس قدر چاہو کتاب کے مطالعہ اور فکر و غور مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اُکتائیگا۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی

[1] صفاریون میں تین بادشاہ ہوئے چالیس برس اُن کی سلطنت رہی ؛

[2] دیلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت ۱۲۸ برس رہی ؛

لطافت وخوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف وظریف ہوئے ہیں شیخ نے بوستان کے دیباچہ میں اہل شیراز کو اُن تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے۔ جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا شیراز سے جس قدر علما و مشائخ و شعرا و مصنفین ابتدا سے اخیر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہُنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے، اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص ہے سرگور اوسلی نے اُس کی ولادت[۱] ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۳۳۳ء میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہُوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی

[۱] اُس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا صرف سال وفات سب نے لکھا ہے یعنی ۶۹۱ھ ہجری اور اُس کی عمر ۱۰۲ یا ۱۱۰ یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے پس کم سے کم عُمر ماننے سے اُس کی ولادت ۵۸۹ھ ہجری میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی جو بغداد میں اُسکا جلیل القدر اُستاد تھا اُس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً ۵۹۷ھ میں ہوئی ہے شیخ کی عمر نو ۹ برس سے زیادہ نہ ہوا اور یہ بالکل خلاف واقع ہے اس لئے اُس کی عمر ۱۰۲ برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیئے۔

تکلہ بن ^ھ^ زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکّن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا اِس لئے اس نے اپنا تخلّص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیساکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخُدا اور متورّع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال واقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے ~

ندانی کہ سعدی مکان از چہ یافت		نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت	
بخوردی بخورد از بزرگان قفا		خدا دادش اندر بزرگی صفا	

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُسکو تربیت کیا ہوگا کیونکہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علّامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقّق طوسی کا شاگرد رشید اور ہولاکو خاں کا مصاحب

^ھ^ بوستان میں تُکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اس کے وقت میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسکا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے جو تھے بادشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے پس شاہان پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے ٭

خاص تھا شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہمعصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں "

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُسکے قرب و جوار میں علما اور مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطۂ فارس میں اہل کمال ہو کر گذر رہے تھے بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامن گیر ہوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسہ عضدیہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُسوقت ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل رحمدل با مروّت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اُس کی طبیعت میں اولو العزمی حد سے

زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اوّل اتابک ازبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اسکے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے ؎

دلم از صحبتِ شیراز بکلّی بگرفت	وقت آنست کہ پُرسی خبر از بغدادم
سعدیا حُبّ وطن گرچہ حدیثیست صحیح	نتواں مرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ۔ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوں سختی سے مرا نہیں جاتا۔

اُس زمانہ میں مسلمانوں کے بیشمار مدرسے بلادِ اسلام میں جا بجا کھُلے ہوئے تھے جہاں دُور دُور سے طالب علم آ آ کر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات۔ نیشاپور۔ اصفہان۔ بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے ان کے سوا شام[۱]۔ عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے

۱؎ کا حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۵ ابر ۱۲

جاری تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسہ سے تعلیم پاکر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں - یہ مدرسہ اسقدر نامور تھا کہ جو علما یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا - امام ابو حامد غزالی - شیخ عراق عبد القادر سہروردی - اُستاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی - شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اُسکا ہموطن شیخ ابو اسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرہ آفاق تھا مدت تک اس مدرسہ کا متولی رہا تھا - جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابو اسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسہ سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا -

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جاکر تحصیل علم شروع کی - اور جیسا کہ بوستان میں اُس نے تصریح کی ہے وہاں سے اُس کے لئے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا - بغداد میں

لہ اِن میں سے مدرسہ ناصریہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں اور مدرسہ واجبیہ واجب کے پوتے زکی ابو القاسم ہبتہ اللہ کا - اور نیز مدرستہ الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دار الحدیث ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر صفی الدین کا قاہرہ میں اور نوریہ نور الدین ارسلان شاہ صاحب موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے ! انکے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ ثقفیہ - قاہریہ - عزیزیہ - عزیہ - زینیہ - نفیسیہ - علائیہ وغیرہ بیت المقدس - موصل - بغداد - دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے ۱۲

جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا اُن میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی ہے جس کا لقب جمال الدین ہے۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بیشمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیّت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے اُن کا تراشہ میرے حجرے میں ہے۔ مرنے کے بعد جب مجھ کو نہلائیں تو غُسل کے لئے اُس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اس کی وصیّت کے مطابق عمل کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علّامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی اور سر گور اوسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوّف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انہیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شیخ سیّد عبدالقادر جیلانی قُدّس سرّہٗ کی وفات ۵۶۱ھ ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حُسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے اُستاد یہ سُن کر

شیخ پر غصے ہوا اور یہ کہا کہ اُور دل گے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اِس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علما کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بدآواز قوال سے پالا پڑا اور بضرورت ساری رات اُس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی صحبت گے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اُسکے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لئے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اُتر گئے تھے وہ کہتا ہے ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقہ کو چھوڑ کر اس کوچہ میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں

کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔
شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اُس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے ؎

بعد از عراق جائے ندیدم نہ خوش ہوائے	ساقی بزن نوائے زاں پردۂ عراقی

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہوچکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہاروں اور ماموں کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا۔ اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے۔ اور بڑے بڑے شہریار اور فرمانروا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہؤا تھا۔ جس کو اُمرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدّت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اور پھر اُسی آنکھ سے اُس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یوروپ۔ ایشیا اور افریقیہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی

لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظُلم و ستم بھی اُس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خاں کے خُونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے اِن حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لئے ایک نہایت عمدہ سبق تھا۔ جس نے اُس کے دل میں قوم کی دلسوزی بادشاہوں کی اصلاح رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اُسی خیال کی بدولت اُسنے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیراندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُسوقت لکھا ہے جب کوئی شخص اُس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار دُنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں ٭

ابیات

	اشعار		ترجمہ
۱	آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین ٭	۱	آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے ٭
۲	اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک سر برآور وین قیامت درمیانِ خلق بین	۲	اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دُنیا میں دیکھ لیجئے ٭

	اشعار		ترجمہ
۳	نازنینانِ حرم را خونِ حلق نازنین ز آستان بگذشت و ما را خونِ دل از آستین	۳	محل کے ناز پروروں کے حلق کا خُون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا ؛
۴	زنہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار در خیال کس نہ گشتی کاینچنان گردد چنین	۴	زمانہ کی گردش اور دُنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہئے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائیگا ؛
۵	دیدہ بردار ایکہ دیدی شوکتِ بیت الحرام قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقان بر زمین	۵	جنہوں نے اُس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھے تھے وہ ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں ؛
۶	خُونِ فرزندانِ عم مصطفےٰ شد ریختہ ہم بر آن خاکی کہ سلطانان نہادندے جبین	۶	کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خُون اُس خاک پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے ؛
۷	بعد ازیں آسایش از دُنیا نباید چشم داشت قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگین	۷	آیندہ دُنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہئے کیونکہ انگوٹھی پر سے جب نگین جاتا رہتا ہے تو نری کلونس

	اشعار		ترجمہ
			رہ جاتی ہے ✢
۸	دجلہ خونا لبست زیں پس گرنہد سر در نشیب خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجین	۸	دجلہ کا پانی یکسر لہو ہو گیا ہے اگر اب جاری رہیگا تو نخلستان بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دیگا ✢
۹	نوحہ لایق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست کمترین دولت مرایشان را بہشت برترین	۹	شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اُن کے لئے ادنیٰ نعمت فردوس بریں ہے ✢
۱۰	لیکن از روئے مسلمانی و راہ مرحمت مہربان را دل نبود در فراق نازنیں	۱۰	ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جُدائی میں کُڑھتا ہے ✢
۱۱	باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز کز لحد با روئے خوں آلودہ برخیزد دفین	۱۱	کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا چہرہ لے کر اُٹھیں گے ✢
۱۲	تکیہ بر دنیا نباید کرد و دل بر وے نہاد کاسماں گاہے بمہر است اے برادر گہ بکین	۱۲	یار و دُنیا پر بھروسا کرنا اور اُس سے دل لگانا نہیں چاہئے کیونکہ آسمان کبھی دوست ہے اور کبھی دشمن ✢
۱۳	زور بازوئے شجاعت بر نیاید با اجل چوں قضا آید نماند قوت رائے رزیں	۱۳	شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی

	اشعار		ترجمہ
			قوت جاتی رہتی ہے ۔
۱۴	تیغ ہندی بر نیاید روز ہیجا از نیام شیر مرد یرا کہ باشد مرگ پنہان در کمین	۱۴	جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے اس کی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی ۔
۱۵	تجربت بیفائدہ است آنرا کہ برگردید بخت حملہ آوردن چہ سود آنرا کہ برگردید زین	۱۵	جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اُس کا امتحان کرنا بیفائدہ ہے اور جب زین اُلٹ گیا پھر حملہ کرنا فضول ہے ۔
۱۶	کرکسانند از پئے مردار دُنیا جنگجوئے اے برادر گر خردمندی چو سیمرغان نشین	۱۶	یاروُ مُردار دُنیا کے لئے گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغوں کی طرح الگ بیٹھو ۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی ۔ نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبّر اور غرور نے اُس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سُنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدّی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر اُس نالائق خلیفہ نے اسکا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفرین سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا۔

کہ اُس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دُنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی اُن میں تزلزل آگیا اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ وپے میں عرب کے خُون کا ایک قطرہ بھی ملا ہُوا تھا جس کے دل میں ایک ذرا برابر اسلام کی حمیت تھی اُس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خُون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باران کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنر مند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو اُن کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا	کہ اپنے مٹنے سے مِہر و وفا کا نام مٹا

القصّہ شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدّتِ دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رہا جب کتاب کے مطالعہ سے اُس کا جی سیر ہو گیا تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیلِ علم کی ہے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کئے ہیں۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصّے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون منو شاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصّوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ

کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا۔ اگرچہ اُس کی شہرت طبقہ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعرا میں ہوئی مگر اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سلجھا ہُوا عالم تھا بعض موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجموعوں میں اُس کو بحث اور مناظرہ کا اتفاق ہُوا ہے اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے جان پہچان کم تھے کسی تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں اُس کا گزر ہُوا۔ اُسوقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علماء و فقہاء کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا۔ اور مشکل سے پائین مجلس میں جگہ ملی۔ اُسوقت کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دُور ہی سے باآواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہُوا۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہئے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہونگے تو پھٹے پُرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمہاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن و ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگذشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگذشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ اُس نے خاص اپنی روئداد لکھی ہے۔

شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر اُس کی ہمّت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اُس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام میں اُس نے مدتوں وعظ کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا اُس نے میرا بیان سُن کر ایسا پُر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیخ اٹھے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب۔ شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے سوا بُت خانۂ سومنات کے قصّہ میں اس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژندگی زبان جانتا تھا۔ سرگور اوسلی لکھتے ہیں کہ ایشیاٹک جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ ۱۸۴۳ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی ٹیسی نے لکھا ہے کہ "سعدی پہلا شخص ہے جس نے

ہندوستانی زبان یعنی ریختہ میں جبکہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے" مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہُوا ہے اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اس کے مشہور ہیں ؂

اشعار

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے	گفتا کہ دُرا ے باورے اس مُلک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمہیں کو دل دیا تم دل لیا اور دُکھ دیا	ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ	شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرہ میں اُن اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔

سر گور اوسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ ۱۸ مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے۔ اس بیان میں ظاہرا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف مُلکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام۔ عراق۔ فلسطین۔ مصر۔ یمن اور ہندوستان میں مدت دراز مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے پس ضرور ہے کہ وہ اِن مُلکوں کی زبان سے

کافی واقفیت رکھتا ہو اس کے سوا اس نے اور بہت سے مُلکوں کی سیر کی ہے جس میں سے اکثر کا ذکر گلستان اور بوستان میں کیا ہے ۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سر گوراوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سُنا۔ اُس نے ایشائے کوچک ۔ بربر ۔ حبش ۔ مصر ۔ شام ۔ فلسطین ۔ آرمینا ۔ عرب جملہ ممالک ایران ۔ اکثر ممالک توران ۔ ہندوستان ۔ ودبار ۔ ویلم ۔ کاشغر ۔ اور جیحون سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے تہین[۱] دال تک کی سیر کی تھی ‘‘ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندوستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ ازانجملہ ایک دفعہ پٹھان اُغلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دلی میں آیا ہے ، ہمارے نزدیک یہ مضمون بالکل بے سروپا ہے ۔ اُغلمش کوئی بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا شاید سلطان التمش کے دھوکے میں اُغلمش لکھا گیا ۔ بیشک شیخ نے اُغلمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے ۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ ’’ سرہنگ زادہ را بر در سرائے اُغلمش دیدم ‘‘ مگر ہندوستان میں کوئی اُغلمش یا سرائے اُغلمش نہیں سُنی گئی ۔ سعدی اور امیر خسرو کی مُلاقات بھی ثابت نہیں ہوتی ۔ اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شُبہ ہُوا ہے ۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندوستان میں آیا ہے ۔ مگر اُس کا کچھ ثبوت نہیں ہے بلکہ شیخ اور

---

[۱] تہین دال سے مراد شاید سد سکندری ہے ۔ کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سد سکندری تک گیا ہوں ۱۲

امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لئے آنا خلاف قیاس ہے خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ ہجری میں ہوئی ہے جبکہ شیخ کی عمر ستّر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرض محال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی۔ تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہئے۔ پس یہ کیونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانہ وقت اور مقبول خاص و عام ہو ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ہندوستان میں آئے البتّہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں شیخ سے دوبارہ درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لئے اُن کا کلام بھی شیخ کے ملاحظہ کے لئے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمّر ہو گیا تھا اس سبب سے خود نہ آسکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جوہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہئے۔

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف بوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تارتار تک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے۔ جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھیرا اور سومنات سے

مغربی ہندوستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا۔ شمال و مغرب کی طرف عراق۔ عجم۔ آذربیجان۔ عراق عرب شام۔ فلسطین۔ اور ایشیائے کوچک میں بارہا اُس کا گزر ہُوا ہے۔ اصفہان۔ تبریز۔ بصرہ۔ کُوفہ۔ واسطہ۔ بیت المقدس۔ طرابلس الشرق۔ دمشق۔ دیار بکر اور اقضائے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اُس کی آمد و رفت رہی ہے۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں پہنچنا۔ اسکندریہ۔ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں۔ شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس۔ بحر عمان۔ بحر ہند۔ بحر عرب۔ بحر قلزم اور بحر روم میں اُس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر مُلکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کئے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ہُوا کہ مَیں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا پیچھے سے ایک شُتر سوار آیا اور اُس نے اُونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو جرس کی آواز سُن کر بھی نہیں اُٹھتا بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحرائے لق و دق چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے۔ جو حجاج کُوفہ سے مکّہ معظّمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستہ کے بیچوں بیچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکّہ معظّمہ ہے۔ اس صحرا میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں

نظر نہیں آتی ایسی راہ سے پیادہ پا حج کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اُٹھائی ہیں۔

کریم خان زند نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے اُس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطہ کے دروازہ پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستان کا ترجمہ انگریزی میں چھپایا ہے۔ اُس میں شیخ کی اُس تصویر[1] کا فوٹوگراف بھی چھاپا ہے شیخ کی شبیہ میں ایک کشکول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تبر اُس کے کندھے پر ہے جو کہ اُس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے۔

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سروسامان اور متوکّل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے اور بعض موقعوں پر اُس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

ساتویں صدی ہجری اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہُوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے جس کا ذکر گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایکبار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنے فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اُس وقت طرابلس الشرق یعنی

[1] بینی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفرنامہ میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا ہے ؂

مشرق کی پہولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لئے شہر میں خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے، جن کو یورپ کے عیسائی بلگیریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے لائے تھے، مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگایا۔ مدّت کے بعد حلب کا ایک معزّز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پُوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قُدرت ہے۔ جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھوڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اس کی ایک بیٹی ناکتخدا تھی شیخ کا نکاح سو دینار مہر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مگر بیوی کی بدمزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آگیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں بے شک میں وہی ہوں۔ دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدّت تک بیت المقدّس اور شام کے شہروں میں سقّائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گذری ہیں۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانہ کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جُوتی تھی اور نہ جُوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگ دل کوفہ کی جامع مسجد میں

پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُسوقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے۔

عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اُس زمانہ میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے شیخ کے پاس آئے اور اُس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی۔ شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے تو بھی کُتے کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اُس نے گلستان اور بوستان میں بیان کئے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب مَیں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا۔ کہ ایک بُت کی پرستش کے لئے دُور دُور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں۔ تو مجھ کو تعجّب ہُوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لئے میں نے ایک برہمن سے ملاقات کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا یہ لوگ اس بیحس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں۔ اور اُس کے سامنے مُورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پوجاریوں کو خبر کردی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اُن کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات

بداعتقادی سے نہیں کہی۔ مَیں خود اس مُورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ مَیں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لئے اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پُوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ مَیں رات بھر وہاں رہا صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مُورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جیسے کوئی دُعا مانگتا ہے یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا "کیوں اب تو کچھ شُبہ باقی نہیں رہا؟" مَیں ظاہرداری سے سُننے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مُورت کے سامنے لے گئے۔ مَیں نے مُورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے مَیں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مُورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا جس کے پیچھے ایک پوجاری چھپا ہُوا بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہُوا کہ جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے۔ فوراً اُس مُورت کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے اسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پوجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ مَیں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے اُس کو پکڑ کر ایک کوئیں میں گرا دیا۔ اس کے بعد فوراً مَیں وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان میں ہوتا ہُوا یمن کے رستہ حجاز میں پُہنچا۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پوجاری اور سینکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سینکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا اس کے سوا ایسے سناٹے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پوجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کوئیں میں دھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اُس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھچ سکی۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے۔ تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دُور جا پڑتا ہے پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے بوستان کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادہ کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اُٹھ کھڑا

ہُوا۔ دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اِس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائیگا۔ اُس سے بادشاہ کو ایک چھینک آئی اور اُس کی گردن جیسے چوٹ لگنے پر ہو گئی تھی۔ ویسی ہی پھر ہو گئی۔ اِسی حکایت کو شیخ نے ایک اور ۳۴ بیت کی مثنوی جو بحر ہزج میں ہے بیان کیا ہے اور یہ اُس کی کلیات میں موجود ہے۔ اِن دونوں مثنویوں میں قصّہ کے جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ ایک بوٹی بھیجی تھی۔ اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا۔ ایک جگہ بادشاہ کا قصّہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا ایک جگہ لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں۔

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشیرطیکہ ناظم کو حُسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو قصّہ جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے پس بہ نسبت اِس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اِس کے بیان کو اس مقام پر ادائے مطلب میں قاصر سمجھا جائے۔

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لئے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہُوا اور ۶۲۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانہ میں وطن نہیں آیا۔ کیونکہ اُس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی

تھی۔ اتابک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہؤا تو اُس نے فارس کو جو دو سو برس سے مورد آفات و حوادث تھا۔ چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کئے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اُس کی شہرت سُن کر آتے اور اُن کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں عبادت خانے۔ مدرسے اور مسجدیں جو ویران ہو گئی تھیں۔ اُس کے عہد میں آباد کی گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لئے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفاخانہ شیراز میں بنوایا۔ اور بڑے بڑے حاذق طبیب اُس پر مامور کئے۔ اپنی دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور ۶۲۳ھ سے ۶۵۸ھ تک سلطنت کی۔ مدت تک اُس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رُخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شُہرہ دُور و نزدیک برابر سُننے میں آیا۔ اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہو گیا۔ تب شام سے عراق عجم ہوتا ہؤا اور اصفہان میں ٹھیرتا ہؤا جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے۔ شیراز میں پُہنچا۔ شیخ کی کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے۔ جس سے ثابت ہے۔ کہ اُس نے ایک مدّت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے ؛-

قطعہ

	اشعار		ترجمہ
۱	ندانی کہ من در اقالیم غُربت چرا روزگارے بکردم درنگے	۱	تجھ کو معلوم نہیں؟ کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا ؛
۲	بروں رفتم از تنگ ترکان کہ دیدم جہان درہم اُفتادہ چون موئے زنگے	۲	مَیں تُرکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ مُلک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہوا تھا ؛
۳	ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن چو گرگان بخونخوارگی تیز چنگے	۳	سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے ؛
۴	درون مردمی چون ملک نیک محضر برون لشکرے چون ہزبران جنگے	۴	شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر شہر کے لوگ جنگی مانند شیروں کے تھے ؛
۵	چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم پلنگان رہا کردہ خوئے پلنگے	۵	جب میں پلٹ کر آیا تو مُلک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی ؛
۶	چنان بود در عہد اوّل کہ دیدم جہان پر ز آشوب و تشویش و تنگے	۶	اگلے زمانہ میں جبکہ مُلک کو آشفتہ اور پریشان اور تنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا ؛

	اشعار		ترجمہ
۷	چنیں شد در ایام سلطان عادل اتابک ابو بکر بن سعد زنگی	۷	اور اب بادشاہ عادل ابو بکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہو گیا ہے ۔

شیراز میں پہنچ کر ظاہر الشیخ نے جامۂ علم و فضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اتابک ابو بکر میں باوجود اُن تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی تھا۔ وہ ہمیشہ علما و فضلا سے بدگمان رہتا تھا۔ اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا اور اُن کے ساتھ کمال ارادت و عقیدت ظاہر کرتا۔ اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر آئمہ و علما کو اُس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا۔ ازاں جملہ امام صدرالدین محمود واعظ اور امام شہاب الدین توہ پشتی اور مولانا عزّ الدین ابراہیم قیسی کو کہ اقسام علوم میں یگانۂ روزگار تھے۔ بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا۔ قاضی عزّ الدین علوی جو کہ سندی سید اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا اُس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ صاحب سعید عمید الدین اسعد کو جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا۔ ماخوذ کیا اور معہ اُس کے بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعہ میں قید کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مر گیا۔

اسی سبب سے اہل علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے۔ اور اکثر جہلا مشائخ کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ وصاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر ابو بکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اُس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نماز مغرب کا وقت آیا تو اسی کو امام بنایا۔

شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی۔ مگر جس قدر اُنہوں نے قرأت میں غلطیاں کیں۔ اُسی قدر اتابک کو اُن کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر اُنہیں رخصت کیا۔

پس شیخ کے لئے علما کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا۔ کیونکہ بہت سی صفات اُس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اُس کا مرجع خلائق بننا ایک ضروری امر تھا۔ مثلاً علم و فضل شاعری۔ لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اہل علم کے مرجع خلائق بننے سے ابوبکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اِس کے علاوہ بادشاہوں اور عالموں کے چال چلن پر خوردہ گیری کرنی ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعی کھولنے اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس غرض کے لئے علماء اور واعظین کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ ظاہراً وہ اِسی سبب سے جیسا کہ گلستان کے دیباچہ میں مذکور ہے۔ ابوبکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جسکا نہایت دردناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے۔ اس سے ارادت اور عقیدت تھی۔ اور اُسی کے نام پر گلستان لکھی گئی ہے۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا۔ اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور اُن کی بدخصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں۔ مگر اُس نے

ایسے لطیف پیرایوں میں اُن پر چوٹیں کی ہیں۔ کہ کسی کو اُس پر گرفت کا موقع نہیں ملا۔
اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر
اس نے تعریضیں کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اوّل مدح و ستائش کی تھوڑی سی
چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے۔ اور اُن کو ظلم اور تعدّی کے بُرے
نتائج سے متنبہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیّت کے حقوق جتائے ہیں اور اُن کی
بے اعتدالیاں ظاہر کیں ہیں۔ اتابک جو علما کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے
زیادہ معتقد تھا۔ اِس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اُس نے
بہت سی حکائتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال
لکھا ہے۔ جو کہ جنگل میں رہتا تھا۔ اور درختوں کے پتّے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس
کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا۔ اور ایک عمدہ بستان سرا میں اُتارا
چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت
لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کے آرام و آسائش پائی شاہ صاحب نے
خوب رنگ و روغن نکالا۔ ہیئت و صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ
قدم بوسی کے لئے حاضر ہُوا اور کہا جس قدر کہ مجھ کو علما اور زہاد سے محبّت ہے۔
ایسی اور کسی گروہ سے نہیں۔ فیلسوف وزیر نے عرض کیا حضور! شرط دوستی یہ
ہے۔ کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے۔ اور اس لئے علما کو روپیہ دینا چاہئے
تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں۔ اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہئے
تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں۔

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے

جو بالکل اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے۔ یعنی ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی۔ تو اِس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا۔ جب اُس کی مراد پوری ہوگئی۔ تو آپ نے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جاکر دے آئے غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن اِدھر اُدھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لئے جیسا گیا تھا۔ ویسا ہی چلا آیا۔ اور عرض کیا حضور! ہرچند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کیا بکتا ہے! میرے نزدیک اِس شہر میں چارسو زاہد سے کم نہ ہوں گے۔ کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں۔ وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سُن کر ہنس پڑا اور فرمایا کہ جتنی مجھ کو درویشوں اور خداپرستوں سے عقیدت ہے۔ اُسی قدر اس مردُود کو اِن سے عداوت ہے۔ مگر کہتا سب سچ ہے۔ اِسی طرح کی اور بہت سی حکائتیں گلستان اور بوستان میں موجود ہیں۔ گلستان کی ایک حکایت میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے نہایت خُوب صورتی سے سلاطین عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور بُرائیاں بیان کی ہیں۔ اس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے۔ جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرف دار اور مداح قرار دیا ہے۔ مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولتمندوں کی مذمت کرتا ہے۔ اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خُوبیاں بیان کرتا ہے، مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے۔ ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اِصلاح کے لئے لِکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جور وظُلم اور بیباکی وسفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دِل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جبکہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علما اور صلحا سے مُلاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جو کہ سلطان اباقا خان[1] کے معتمد وزیر تھے۔ اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے۔ اُن سے بھی مُلاقات کرے ایک روز اُن سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا کہ اباقا خاں کی سواری آتی ہے۔ اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑے سے اُتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیئے بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا۔ حاضرین سے کہنے لگا۔ کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اس راہرو آدمی کی برابر نہیں کی یہ کون شخص ہے؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مِل کر واپس آئے تو اباقا خاں نے خواجہ شمس الدین سے پُوچھا کہ یہ کون شخص تھا۔ جس کی تُم نے اِس قدر تعظیم کی صاحب دیوان نے عرض کیا حضور یہ ہمارا شیخ ہے حضور نے سُنا ہوگا۔ شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اِس کا کلام ایک عالم میں مشہور ومعروف ہے۔ اباقا خاں نے کہا کہ اِس سے ہم کو بھی ملواؤ۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اُس کو

[1] ہلاکو خان کا بیٹا جو اُس کے بعد بادشاہ ہُوا ۱۲

بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا۔ تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا دُنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی مگر نیکی یا بدی۔ اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سو لے جاؤ۔ ابا قاخان نے کہا اس مضمون کو نظم کرو تو بہتر ہو۔ شیخ نے اسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا ؎

	شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد		حلال باد خراجش کہ مزدِ چوپانی است
	وگرنہ راعیِ خلق است۔ زہرمارش باد		کہ ہر چہ میخورد از جزیہ مسلمانی است

ابا قاخان یہ قطعہ سُن کر آبدیدہ ہو گیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ مَیں راعی ہوں یا نہیں۔ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا۔ کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت۔ ابا قاخاں شیخ کی اِس آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہُوا اور شیخ کو بہت عزّت سے رُخصت کیا۔

علی بن احمد جامع کلیّات شیخ اِس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ و علما ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لئے زمانہ کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

مَیں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابا قاخان کا بیٹا چنگیز خاں کا پوتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اگرچہ ابا قاخان کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی لیکن وہ بہرحال اسلام سے بیگانہ تھا۔ اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی۔ ایسا کام اُسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدہ کی اُمید جیسا کہ شیخ نے گلستان میں خود لکھا ہے۔ " نصیحت بادشاہان

گفتن کسے را مسلّم است کہ بیم سر ندارد و اُمید زر۔"

سردار انکیانو جو بعد زوال خاندان اتابکیہ کے ۶۶۷ھ ہجری میں سلطان اباقاخان کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہُوا تھا۔ ایک مغل صاحب ہیبت و شان نہایت رُعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا۔ اور ہمیشہ علمائے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی۔ جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پندنامہ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اِس پندنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ۔ حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ہی میں ختم کر دیئے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تُربت پر معتکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا۔ مسجد میں آیا اور نماز و دُعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملہ کا اندیشہ ہے۔ آپ میرے لئے دُعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیّت پر رحم کر تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی اُمید رکھی اُس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ اُمید باندھی ہے۔

اگرچہ سلطنت عہد کے اعیان وارکان میں شیخ کے معتقد وارادتمند بے شمار تھے۔ لیکن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعہ نظم کا نام صاحبیہ رکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اوّل مغول تاتار کی فتوحات کے بیان میں تاریخ جہان کشا لکھی ہے شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبّت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جوین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطّہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعہ سے خان تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خاں نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جوَینی کو عطا کی تھی اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو مُلک بغداد اور اُس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خاں کے بعد اباقاخان باپ کا جانشین ہُوا۔ تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل اُس کے قبضہ میں دے دی۔ اب اُس نے مہمات سلطنت کے انصرام سپاہ و رعیّت کی دلجوئی اور تمام مُلکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق۔ خُراسان۔ بغداد۔ شام اور ارمینیہ کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اُس کی فیّاضی اور سخاوت کی دھوم دُور و نزدیک پُہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارۂ جیحون سے شام اور ایشیائے کوچک تک نافذ و رجاری تھا۔ اس پر وہ علما و فُضلا کے ساتھ بکمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا۔ اور

اُن کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کی تعظیم و مدارات اُن کے مرتبہ کے موافق کرتا تھا۔ اور علاوہ کمالات علمی کے علم ادب اور شعر میں بھی اُس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شائع ہُوا اور اُسی کے فیض صحبت سے اباقا خان کے بھائی سلطان[1] احمد نے اپنے گھرانے میں سب سے اوّل اسلام قبول کیا آخر ارغون خان برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے ۶۶۳ھ ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی۔ اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیّت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلائے تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ وصاف میں بجنسہٖ منقول ہے اور جس سے اُس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔

اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانہ میں اُس اُجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکو خان کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا چند روز میں اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو معمور کر دیا۔ نجف اشرف میں نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہُوا اور فرات کا پانی کُوفہ کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے۔ وہ اِس فیاض اور دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے تاریخ جہان کشا جو اُس نے تاتاریوں کی فتوحات کے بیان میں لکھی ہے وہ اُن تمام

[1] سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا تاتاریوں میں اِس سے پہلے صرف برکہ خان جوجی خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہُوا تھا۔ جس کے پاس خوارزم دشت قبچاق اور رُوس وغیرہ کی حکومت تھی ۱۲

تاریخوں کا ماخذ ہے جو اِس باب میں لکھی گئی ہیں۔

الغرض یہ دونوں بھائی جو کہ دُنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالات علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔ اور نیک سیرتی اور حُسن اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے شیخ سعدی کے ساتھ ان کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا۔ اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے اِن دونوں سے انتہا درجہ کی محبّت اور اُلفت تھی۔ ظاہرا جب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی۔ اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاء الدین تھے۔ ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانسو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دارالسلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کے معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھروسے پر اُس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لئے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کئے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانسو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیئے اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا ۵

خواجہ تشریفم فرستادی و مال	مالت افزون باد و خصمت پائمال
ہر بدیناریت سالے عُمر باد	تا بمانی سہ صد و پنجاہ سال

ترجمہ۔ تم نے مجھ کو عزّت دی اور نقدی بھیجی۔ تمہاری دولت زیادہ اور تمہارے دشمن پائمال ہوں۔ تمہاری عُمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو جیو تاکہ تم ساڑھے تین سو برس دُنیا میں رہو ؛

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور

رقم کی بابت تدارک مافات کر کے شیخ سے معافی چاہی - اِس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں - ایک بار اُس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا - جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اس کے تقاضے کے لئے یہ قطعہ لکھ بھیجا -

قطعہ

سفینہ حکمیات و نظم و نثر لطیف	کہ بارگاہ ملوک و صدور را شاید
بصدر صاحب صاحبقران فرستادم	مگر بعین عنایت قبول فرماید
سفینہ رفت و ندانم رسید یا نرسید	بدان دلیل کہ آیندہ دیر می آید
بپارسائے ازین حال مشورت بروم	مگر چہ خاطر من بند بستہ بکشاید
چہ گفت - گفت ندانی کہ خواجہ دریائیست	نہ ہر سفینہ زوریا درست باز آید

ایک بار خواجہ علاء الدین نے جلال الدین ختنی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا - تبریز سے یہ حکم بھیجا کہ اِس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیجدو مگر اُسوقت

ملا برندق بخارائی جو کہ ایک زبردست شاعر ہے اُس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے - بادشاہ نے اُس کو پانسو تومان انعام میں بھیجے تھے - مگر اُس کو دوسو پہنچے اُس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا قطعہ

شاہ دشمن گداز دوست نواز	آن جہانگیر کو جہان دار است	بش یوز آلتون کرم نمود بمن	لطف سلطان بہ بندہ بسیار است
سہ صد از جملہ غائب است کنون	در برآتم و صد پدیدار است	یا مگر من غلط شنو دستم	یا کہ پروانچی طلبگار است
	یا مگر در عبارت ترکی	بش یوز آلتون دویست دینار است	

مگر اِس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی سی شوخی اور لطافت نہیں ہے - بس یوز آلتوں کو بش یز اُلتن پڑھنا چاہئے - یہ تُرکی الفاظ ہیں - جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے ؞

جلال الدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ اِس لئے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی جب شیخ کو اِس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاء الدین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

پیامِ صاحب دیوان علائے دولت و دین	کہ دین بدولت ایام او ہمی نازد
رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را	بسے نماند کہ سر بفلک برافرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین	قبول حضرت او را تعہدے سازد
ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود	چنانکہ بر ہمہ ابنائے دہر مے تازد
جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا	کہ بندگان خداوندگار بنوازد
طمع بریدم ازو در سرائے عقبےٰ نیز	کہ از مظالم مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ۔ صاحب دیوان علاء الدین جس کے عہد دولت پر دین کو ناز ہے اُس کی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزّت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسمان تک پہنچ جائے۔ اِس میں حکم تھا۔ کہ امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر لشکر اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی۔ جیسی کہ سب پر ہوا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دُنیا میں تو آنے والا ہے نہیں کہ خدا کے بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے اُمید قطع کی کیونکہ وہاں لوگوں کے استغاثے اُس کو میری طرف کاہے کو متوجہ ہونے دینگے۔

خواجہ علاء الدین نے فوراً اُس کی تلافی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اُس کی قبر ہے یہ بھی صاحب دیوان کے روپیہ سے بنی تھی۔ اس کام کے پچاس ہزار دینار اُس نے شیخ کو دیئے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحب دیوان نے بہزار منّت و سماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اِس رقم سے ایک عالی شان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشۂ شمال و مغرب

میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشین رہا۔
شیخ سے اکثر اہل علم حقائق اور معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے۔ اور ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ ازاں جملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشّاق و ماہر تھا۔ نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اِس قطعہ سے اُس زمانہ کے علما کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے اِس لئے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ **قطعہ**

سالک راخدا پادشہ ملک سخن	اے زالفاظ تو آفاق پراز درّ یتیم
اختر سعدی و عالم ز فروغ تو منیر	واضع عقلی و گیتی ز نظیر تو عقیم
پیش اشعار تو شعر دگران راچہ محل	سحر بے وقع نماید بر اعجاز کلیم
بندہ راز تو سوالی است کہ تو جیہ سوال	نکند مردم پاکیزہ سیر جز بہ کریم
مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق	این دربستہ تو بکشائے کہ بابیست عظیم
گرچہ این ہر دو بیک شخص نیایند فرود	در دماغ و دل بیدار تو ہستند مقیم
پایۂ منصب ہر یک ز کرم باز نمائی	تا زالفاظ خوشت تازہ شود جان سقیم
باد آسودہ و فارغ زبد و نیک جہان	خاطر آئینہ کردار تو چون نفس حکیم

شیخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے۔ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا۔ وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور اطاعت کرتا تھا۔ سرِ دارانکیانو کو وہ برابر قصائد اور پند نامہ وغیرہ میں اِس طرح خطاب

کرتا ہے۔ جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اُس کے سوا ملک عادل شمس الدین جو کہ غالباً انکیانو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا۔ وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں سبزی فروشوں کے ہاتھوں جبراً کسی وعدہ پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دکان پر بھی جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اِس زمانہ میں حضرت ابو عبداللہ خفیف[۱] کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اِس واقعہ کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک شمس الدین کو جو کہ اِس حال سے بے خبر تھا ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہل فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دوکانداری اور بینوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے خرچ کے لئے ہے۔ اس کو قبول کیجئے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی۔

شیخ کی وفات[۲] شیراز میں جبکہ اتابکان فارس کے خاندان کا خاتمہ ہوچکا تھا اور

[۱] یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف کی برابر نہیں ہیں ۱۲

[۲] سرگور اوسلی نے اُس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر سلغر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اتابک محمد شاہ ۶۶۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مرگیا۔ پھر اُسکا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور ۶۶۲ھ میں قتل کیا گیا۔ پھر سعد زنگی کی بیٹی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲ پر دیکھو)

ولایت فارس خانان تاتار کی حکومت میں آگئی تھی ۶۹۱ھ ہجری میں واقع ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اِس طرح کہی ہے ؎

دُرِ بحرِ معارف شیخ سعدی	کہ در دریائے معنی بود غواص
مہ شوال روز جمعہ روحش	بدان درگاہ رفت از روی اخلاص
یکے پُرسید سال فوت گفتم	زخاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص ۶۹۱

شیخ کی عُمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے زمانہ میں شیراز سے باہر گیا۔ اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کیا ہے۔ امام ابن جوزی کی وفات ۵۹۷ھ میں ہو چکی تھی۔ اور شیخ کی وفات اُس سے ۹۴ برس بعد واقع ہوئی پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا۔ اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانہ میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے اُسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے۔

آبش خاتون کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا۔ اور ۶۶۷ھ میں اُس کو معزول کر کے سلطان اباقاخاں نے سردار انکیانو کو جو کہ شیخ کا ممدوح ہے حاکم فارس مقرر کیا۔ اب آگے کوئی متنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ خاندان اتابک کے زوال سے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے ۱۲

سر گور اوسلی نے انگلستان کے ایک سیّاح ولیم فرینکلن کے سفر نامہ سے۔ جو کہ ۱۷۸۶ء میں فارس گیا تھا شیخ کے مدفن کا حال اِس طرح لکھا ہے کہ "شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اُس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے۔ جس میں شیخ کا اور اُس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے جس پر سُنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اُس پر شیخ ہی کا ایک شعر خط نستعلیق میں لکھا ہُوا ہے۔ جب اِس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں۔ وہ پھُول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعہ کے لئے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہُوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں۔ یہ اشعار اُنہوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اب اس کی خبر جلد نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائیگی۔ نہایت افسوس کی بات ہے۔ اور زمانہ کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اُس کی مرمّت کرانے کا خیال نہیں۔ اس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں۔ جنہوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے۔ اِس کے بعد سر گور اوسلی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ۱۸۱۱ء کے شروع میں جبکہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاچار کے پاس

پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا۔ اُس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ اُس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہوگئی ہے۔ اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہُوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے۔ اُن کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اِس مقبرہ کی مرمّت بخوبی ہو سکتی ہے اور میرے حُسن عقیدت نے جو کہ مَیں شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا۔ مجھ کو آمادہ کیا۔ کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرہ کی مرمّت کرا دوں۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا۔ اُس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا۔ اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ مَیں اپنے روپیہ سے مزار کی مرمّت کرا دوں گا۔ آپ کیوں اِس قدر تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ مَیں شیخ کے مزار کی مرمّت اُسی خوبی اور اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا۔ جیسے کریم خان زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

نہایت تاسّف کا مقام ہے۔ کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا۔ جس سے معلوم ہو کہ وہ خطّۂ ایران کا فخر جو زہد و تقوےٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا۔ کہاں اور کس جگہ دفن ہُوا ہے۔

سُبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس کنارہ

کا رہنے والا جہاں دُنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے با وجود اختلاف مذہب - اختلاف قوم اور اختلاف مُلک کے ایک مسلمان مصنّف کی ایسی قدر کرے کہ عالم سفر میں اُس کے مقبرہ کی مرمّت کرانے پر آمادہ ہوا ور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادہ سے باوجود اتّحادِ زبان - اتّحاد مذہب - اتّحاد قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے +

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شُہرت اُس کی زندگی میں

شیخ کی جادُو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران ترکستان تاتار اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا۔ کہ اُس زمانہ کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچہ میں کہتا ہے" ذکرِ جمیل سعدی کہ در افواہ عام اُفتادہ وصیت سخنش کہ در بسیط زمین رفتہ" شیراز اور کاشغر میں کچھ کم ۱۶۰۰ میل کا فاصلہ ہے پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے۔

جس زمانہ میں شیخ کاشغر پُہنچا ہے۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خان چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کرچکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لئے اُس کی صلح ہوگئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمہ زمخشری[1] ہاتھ میں لئے زبان سے یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ضرب زیدٌ عمرواً" شیخ اُس سے چُہل کی

[1] علامہ جاراللہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس کا نام مقدمہ زمخشری ہے ؛

باتیں کرنے لگا اور کہا کیوں صاحب خوارزم وخطا میں صلح ہوگئی مگر زید اور عمر کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا خاک پاک شیراز۔ اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟ شیخ نے بطریق مزاح اُسی وقت دو عربی شعر کہہ کر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھیئے۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔ شعر

	ما بتو مشغول و تو با عمرو زید		اے دِل عشّاق بدام توصید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اِس طالب علم سے کہدیا کہ سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہؤا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپنے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجئے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں۔ اِس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے ؛

اشعار

	قناعت کردہ از دنیا بہ غارے		بزرگے دیدم اندر کوہسارے
	کہ بارے بند از دل برکشائی		چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی
	چو گل بسیار شد پیلان بلغزند		بگفت آنجا پریرویان نغزند

اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ میل ہے۔ دوبار خاں شہید سلطان محمد قاآن نے شیخ کی شہرت سن کر اُس کو وطن سے بلایا۔ مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا۔

تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام[۵۱] تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ نہایت مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہُوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے۔ فوراً نہایت شرمندگی سے عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعظیم اور ادب سے اس کی مہمانداری کی۔

سرگور اوسلی نے کتاب مجالس العشّاق سے ایک حکایت نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسمٰعیلی مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہُوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے۔ شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام وہاں عموماً زبان زد خلائق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے۔ جن کو سُن کر شیخ محظوظ ہُوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھُل گئی۔ شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا۔ اور بہت خوشی سے دل کھول کر اُس کی مہمان داری کی۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُس کو دکھائیں گے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا۔ اُس کو کمال افسوس ہُوا

۵۱۔ خواجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے اُمرا میں سے تھا اور شاعری میں تمام معاصرین اُس کو مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور ۷۱۳ھ میں وفات پائی۔

اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمان داری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ حُسن اتّفاق سے شیخ کا گزر قہستان میں ہُوا اور حکیم نزاری سے مُلاقات ہوئی۔ حکیم بہت محبّت اور اخلاق سے پیش آیا مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلّف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بُھنے ہوئے تیتر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہُوا پارچہ اور خُشکا تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلّفات کئے تھے اُس طرح سے مہمان آخر کو بار خاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے شیخ کو اُس جملہ کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا۔ اب معلوم ہُوا۔

اس حکایت سے شیخ کی شُہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مذہبی تعصّبات سے مبرّا تھا۔ فرقہ اسمٰعیلہ کے لوگ اُس زمانہ میں عموماً ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی فرقہ مسلمانوں کے نزدیک اسمٰعیلوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا۔ پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی۔ کہ اس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمٰعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا۔ اور اُس کا مہمان رہا۔ الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانہ میں تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے حاصل کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ۔

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے - مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا - انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے - اور وہ یہ قطعہ ہے -

قطعہ

در شعر سہ کس پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے نفحات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر پر اس پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی خضر کی مُلاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا لعاب دہن اُس کے مُنہ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی -

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی نہ سپہر میں غزل کا اُستاد مانا ہے لیکن دیگر اصناف سخن میں کنایتاً اپنے کو ترجیح دی ہے مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں - شعر

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت	شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے زمانہ کے اہل مذاق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے وہ کہتے ہیں - شعر

حسن گلے زگلستان سعدی آوردہ است | کہ اہل معنی گلچین از ین گلستان اند

خواجہ مجدالدین ہمگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلاکو خاں کے رُکن سلطنت بھی تھے۔ یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان۔ امیر معین الدین پروانہ حاکم روم ملک افتخار الدین کرمانی اور مُلّا نورالدین صدری نے باتّفاق ہمدگر ایک قطعہ مرتّب کرکے مجد ہمگر کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں امامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی۔ اُس کے جواب میں مجد ہمگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی ؛

رباعی

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم	بر شکّر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم	ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ رسیم

اس رباعی میں اگرچہ ہمگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے۔

حاجی لطف علی خان آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض مدعیان شعر نے مجدالدین ہمگر سے کہ بعنایت الٰہی پستی طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا۔ اُنہوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رُباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ

لہ شیخ نے بھی اس رباعی کو سُن کر ایک رُباعی لکھی ہے جو اس کے کلیات میں موجود ہے یعنی "ہر کس کہ بہ بارگاہ ساحی نرسد از بخت سیاہ و بدکلامی نرسد ؛ ہمگر کہ بعمر خود نہ کردہ است نماز ؛ شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد" ؛

ہمارے زمانہ میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہل مذاق جانتے ہیں کہ ہمگر کی تحقیق کیسی پھسپھسی ہے۔ ہاں انہوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ مَیں امامی کے درجہ کو نہیں پہنچا۔ بیشک امامی کا مرتبہ جناب صاحب باعی سے بہت بالا ہے۔ لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے بلکہ تین شخصوں[۱] کے سوا اور کسی کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے۔ مَیں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانشمندوں پر سخت گذرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخنوروں پر بھی گذرا ہے یا نہیں جب یہ حکایت میری نظر سے گذری تو مجھ کو صبر آ گیا۔" حاجی موصوف نے اِس مقام پر مجد ہمگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔

قطعہ

یکے گفت۔ امامی امام ہری را	زسعدی فزون یافتہ مجد ہمگر
درین ماجرا چیست رائے تو۔ گفتم	ستمگر بود مجد ہمگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہمگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گذرے ہیں۔ نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رُتبہ میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ معاصرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گذرتا گیا اُسی قدر وہ پردے مُرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانہ میں دو اہل کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصّبین کا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف

۱؎ شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی۔ انوری اور نظامی ہیں۔

اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں اور اس طرح بڑھتے بڑھتے دو بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے۔ وہ بغیر بحث وحجّت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا۔ کہ عنقریب ایک کلام اطراف عالم میں پھیل جائے گا۔ اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائیگا۔

کلام شیخ کی مقبولیّت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے۔ ایک رات اُنہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نُور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پُوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے۔ جو جناب الٰہی میں مقبول ہوئی۔ یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار	ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے غزلت خانہ پر یہ مژدہ سُنانے کے لئے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کئے ہوئے جھُوم جھُوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو۔ لیکن ہم کو اس میں کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی خواب کا سچّا ہونا اور اِن میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلّم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اُس کا انکار نہیں کرسکتے اس کے علاوہ ہم اِس

حکایت سے ہر حال ہیں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اُس کے بیان کے لئے کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔

اِس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لئے شیخ ابوالفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے۔ یعنی یہ کہ فیضی نے نلدمن کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا۔ شعر

	در ہر بن موکرمے نہی گوش	فوارۂ فیض اوست در جوش	

تو اُس نے بھی ویسے ہی صلہ کی توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسمان کی طرف مُنہ کیا اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے بیخال کی جو فیضی کے منہ پر آکر پڑی وہ بہت جھنجھلایا اور کہا ع "شعر فہمی عالم بالا معلوم شد" ظاہرا یہ مضمون عبدالقادر بدوانی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے یا اُس کے کسی تتبع کا گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ "سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی۔ اِس لئے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہُوا ہوگا"۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہرا یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضہ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی زمانہ میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اُس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر اور ذلیل اور ہیچ و پوچ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم

یقین آتا ہے۔ اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اُس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔

سر ولیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سر گور اوسلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ سعدی نے تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ اتابکان فارس وہاں کے اہل کمال کو تقویت دے رہے تھے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے تھے۔ حالانکہ اُس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گذری تھی باوجود اس کے کہ کسی ایسے شخص نے بھی جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا۔

انگلستان کے بعض اور مصنفوں نے اس کو مشرقی شکسپیئر کہا ہے۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو کہ شکسپیئر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں۔ کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ انگریز شکسپیئر کو تمام دُنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں تو دیکھنا چاہئے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا شکسپیر کہتے ہیں اُنھوں نے اُس کو کس درجہ کا شاعر تسلیم کیا ہے۔

شکسپیئر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ صاف اور دلنشین ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت اور پند پر رکھی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کُھلم کھلا نصیحت

کرتا ہے اور شکسپیئر کے پلے (یعنی ناٹک) سُن کر کسی شخص کو یہ خیال نہیں گذرتا کہ یہ میرے ہمجنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں۔ یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے۔ مگر اُس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے۔ بلکہ یہ گپتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیز دونوں کا کلام مقبول اور دلنشین ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح شکسپیئر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح شیخ کی گلستان اور بوستان کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حُسن اور یہ بات کہ اُنہوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلّط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہُوا ہے ثابت ہوتی ہے اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلّم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں۔ اور اِسی طرح یورپ میں جس قدر شکسپئیر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہٖ مقبول اور دلنشین ہونے کے قابل نہ ہو کسی طرح ممکن نہیں کہ اِس طرح تمام ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے ؞

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم۔ نثر۔ فارسی اور عربی جو اِس وقت متداول ہے۔ اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے۔ حسب تفصیل ذیل ہے :۔

(۱) نثر میں چند مختصر رسالے (جس میں سلوک اور تصوّف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکائتیں اور ملوک واحکام کے لئے نصیحتیں لکھی ہیں) (۲) گلستان (۳) بوستان (۴) پند نامہ (جس کو عُرف عام میں کریما کہتے ہیں (۵) قصائد فارسی (جن میں مرثیے۔ ملمعات۔ مثلثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں) (۶) قصائد عربیہ (۷) غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیّبات (۸) دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع (۹) تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم (۱۰) غزلیات قدیم جو غالباً عنفوان شباب کی لکھی ہوئی ہیں (۱۱) مجموعہ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات۔ ثنویات۔ رُباعیات اور مُفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے (۲) مطائبات و ہزلیات۔

ان تمام کتابوں اور رسالوں میں سے ثنوی پند نامہ یعنی کریما کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اوّل تو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ ثنوی نہیں دیکھی گئی دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو پختگی اور جزالت یا دلفریبی اور جادُو پایا جاتا ہے اُس سے یہ ثنوی معرّا ہے مگر ہمارے نزدیک اِس ثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردّد کی بات نہیں ہے یہ سچ ہے کہ بوستان اور شیخ کی عام نظم کے مقابلہ میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس شاعر کا حال بالکل اِس شعر کا مصداق ہے۔ شعر

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم	گہے بر پُشتِ پائے خود نہ بینم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہذیان اور یہی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے۔ کما قال اللہ تعالےٰ

لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا

کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جانا بھی اِس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اس نے اس کو بھی کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیّات میں اِسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

بہر حال ہم جس طرح اِس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اِسی طرح اُس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے۔

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک کہ ہماری محدود واقفیّت اور ناچیز رائے مساعدت کریگی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کرینگے۔ ناظرین باتمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اُس کو متعصبانہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں۔ بلکہ اِس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اُسی قدر مواخذہ کے قابل ٹھیرائیں۔ جس قدر کہ ایک غلط (مگر سچی) رائے پر مواخذہ ہو سکتا ہے۔

گلستان اور بوستان

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور اُن کے عیب و خُوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہوا اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اُس پر ریویو لکھنا اور اُس کی خُوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح بدیہیات

پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی طرح ایسے مقبول اور مسلّم کتابوں کے محاسن بیان کرنے مشکل ہیں اور اسی طرح اُن پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمہ لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

اِن دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہئے۔ ظاہراً فارسی زبان میں کوئی کتاب اِن سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی ایران۔ ترکستان۔ تاتار۔ افغانستان اور ہندوستان میں اِن کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں اِن کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے لاکھوں اُستادوں نے انہیں پڑھایا۔ اور کروڑوں شاگردوں نے انہیں پڑھا اِن کے بے شمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں اِن کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علما نے اِن کی عزّت کی۔ بادشاہوں نے اِن کو سلطنت کا دستورالعمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے اِن کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سر جھکایا اور اُن کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا اِن کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول۔ فصاحت۔ بلاغت۔ تہذیب اخلاق پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم کر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے۔ اَحَدُ هُمَا اَفْضَلُ مِنَ الْاٰخِرَۃِ لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستان کو بوستان پر ترجیح دی جائے

تو کچھ بیجا نہیں ہے۔

فارسی نظم میں بوستان کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستان سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اُس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اُس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستان کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سر گور اوسلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنیٹس نے لاطینی میں کیا تھا اُس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرۂ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہؤا ہے اُس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں۔ ایسی اور کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ۔ مثنوی معنوی۔ گلستان اور دیوان حافظ۔

ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوتی ہیں۔ جیسی ایران میں مگر سب کی شہرت اور قبولیّت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بیساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور وہ یہ خُوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اِس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیّت کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلّف اور تصنّع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں۔ جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے

مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانہ کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں۔ سب سے اوّل شاہنامہ پر غور کرو قطع نظر اس سے کہ قدیم زمانہ کے حالات اور گذشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محاربات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں کہ شاہنامہ لکھا گیا اُس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکرکشی و کشورکشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہُوا تھا۔ اور شُجاعت و بہادری کے مضمون اُن کو دل سے پسند آتے تھے۔ پس ایک رزمیہ نظم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جاتا اُن کی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صدہا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبان پر جاری ہوگئی تھیں۔ اور آخر کو اُس کا یہاں تک رواج ہوگیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خوان نوکر رکھے جاتے تھے اور قہوہ خانوں میں جابجا گرمیٔ صحبت کے لئے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اِس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصّے جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا۔ طہمورث دیوبند کا دیووں کا قید کرنا۔ جامِ جمشید کے کرشمے۔ رُستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اُس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سُہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا۔ اُس کا سیکڑوں دیووں کو مارنا اور مغلوب کرنا۔ اُس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا۔ دِژ بہمن کا طلسم ٹُوٹنا اور اِسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصّۂ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اُس میں درج تھے جو تمام دُنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں۔ اِن باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی یادہ

مقبول اور عام پسند کر دیا تھا۔

مولانا روم کی مثنوی اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی جبکہ ہمارے لٹریچر میں تصوّف اور معرفت کا تسلّط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربی۔ شیخ صدر الدین قونوی شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ علاء الدولہ سمنانی۔ وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوّف کی رُوح پھونک رہی تھیں شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ جی لبھانے لگے تھے شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبی اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزا معلوم ہونے لگی تھیں۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوّف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا۔ جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویّہ کے عہد میں حملہ حیدری کا اس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب و غریب قصّے اور فوق العادہ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور اُن میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کئے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوّف کے علاوہ قصّہ کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا رُوم کے حق میں "نیست پیغمبر و لے دارد کتاب" اور مثنوی کے حق میں "ہست قرآن در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے۔

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا جو کہ ہمیشہ سے دُنیا میں مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف

کھینچتے ہیں۔ اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اِس خیال نے کہ اُس میں عشق حقیقی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ اُس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دلرُبا کر دیا تھا۔ پس اِن تینوں کتابوں کا اِس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔

گلستان میں اِن وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اُس میں رزم تھی نہ عجیبؔ غریب افسانے تھے نہ فوق العادۃ قصّے۔ نہ حقائق و معارف۔ نہ شریعت کے اسرار۔ نہ طریقت کے نکات۔ نہ غزل عاشقانہ۔ قولِ عارفانہ بلکہ اُس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی۔ جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصّہ یا ناٹک کے پیرایہ میں نہ ادا کی جائے اکثر مخاطب کی وحشت اور تنفر کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کُھلی نصیحتوں سے متنفرّ اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ پس گلستان کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ اس کی فصاحت و بلاغت اور حُسن بیان اور لُطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا۔

گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اِس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اِس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہُوا۔ خود شیخ ہی کے زمانہ میں گلستان کے اکثر قطعات و ابیات اِس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے۔ کہ اُس زمانہ کے فضلا اور اُدبا اُس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زور طبع اور قدرت نظم دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب نامدار فضل اللہ

بن عبداللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانہ میں تھا۔ اپنی مشہور تاریخ وصاف میں گلستان کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قطعہ سعدی

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمہ عربیہ

اِذا ھو فِی الحمام طین طیّبٌ — توصّل مِن ایدی کریم اِلیٰ یدی
فقلتُ لہٗ ھَل انت مشکٌ و عنبرٌ — فانی من ریّاک سکران معتدٍ
اَجاب بانی کُنتُ طیناً مُذ تلاً — فجالسنی للودِ الجنی بمعھدٍ
فاثرفِی خلقی کما مجالسی — والّا انا التراب الذی کنت فی یدٍ

قطعہ سعدی

گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند — تا دلِ خویش نیازارد و درہم نشود
سنگ بدگوہر اگر کاسئہ زریں بشکست — قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نشود

ترجمہ عربیہ

اِنّ نال ندٌ مِنَ الاندالِ مَنقصۃً — حاشیٰ لہٗ ان یذیب النفس بالضجرِ
فَالتّبرُ مِن حجرٍ اِذ صار منکسراً — فالتبرُ تبرٌ وما یزداد فی الحجرِ

پھر ایک مدّت کے بعد تمام گلستان کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہُوا جو کئی صدیوں تک عرب۔ شام۔ رُوم اور مصر میں متداول رہا اور حال ہیں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے۔ اُس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ کا نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے۔ اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اُس کے متعدّد ترجمے سُنے گئے ہیں جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبد الحمید خان کے بھائی اور ولیعہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے۔ یورپ میں گلستان اور بوستان کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں۔ اُن کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور اڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو ۱۸۵۲ء تک چھپے اور شائع ہوئے۔ اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

گلستان کے ترجمے بوستان کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جنٹس نے اصل گلستان معہ لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے امسٹرڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈوراٹر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسل تھا فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا جو کہ ۱۶۳۴ء میں بمقام پیرس چھپا۔ اُس کے بعد اصل کتاب سے گارڈین نے ۱۷۸۹ء میں اور سیمالیٹ نے ۱۸۳۴ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرنچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں اولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے وہ اُس کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس ترجمہ میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمہ سے پہلے ڈوراٹر کے فرنچ ترجمہ سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اوّل ۱۶۵۴ء میں بمقام سیلزوگ چھپا تھا۔ اور اُسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر امسٹرڈم میں چھپا۔

اولی ابریس نے بوستان کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستان کا ایک اور ترجمہ کے۔ اچ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو ۱۸۴۶ء میں بمقام لیپزگ چھپا ہے۔ اسی مترجم نے بوستان کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹن ہے اور جو ۱۸۵۰ء میں دو جلدوں میں چھپا ہے۔ انگریزی میں گلستان کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو مقام لندن ۱۸۰۸ء میں چھپا دوسرا ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے لئے کیا گیا تھا ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں جو ۱۸۵۲ء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ سعدی کی کلیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے ۱۷۹۱ء میں چھپائی تھی۔ اور گلیڈون نے صرف گلستان ۱۸۰۶ء میں چھپوائی جو دوبارہ ۱۸۰۹ء میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر ۱۸۰۷ء میں جس ڈیمولن نے گلستان معہ اپنے ترجمہ کے کلکتہ میں چھپوائی جو کہ اُسوقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے۔ پروفیسر فاکر نے فارسی خوان طلبہ کے لئے بوستان کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے۔ اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیاٹک جرنل میں معہ متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگر نے ۱۸۵۱ء میں بمقام کلکتہ گلستان معہ اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ ۱۸۵۰ء میں اُس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے معہ فرہنگ کے شائع کیا۔

مذکورہ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش سائیکلوپیڈیا میں کیا گیا ہے۔ اور بہت سے نئے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً ۱۸۵۰ء کے بعد شائع ہوئے ہیں ازاں جملہ ۱۸۷۱ء میں جان پلیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے اصل گلستان

معہ انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی۔ اور کپتان ولبر فورس کلارک نے بوستان کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۹ء میں کیا وہ لکھتے ہیں۔ کہ یہ ترجمہ اُس نسخہ سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں ۱۸۵۱ء میں چھپا تھا۔ پھر حال ہی میں بوستان کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکنن نے نظم میں کیا ہے۔ جس کا نام فلورز فروم دی بوستان رکھا ہے۔

ہندوستان میں متعدد زبانوں میں گلستان کا ترجمہ ہُوا ہے۔ از انجملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اُردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے مگر چونکہ اُس وقت تک اُردو زبان خوب منجھکر صاف نہ ہوئی تھی اس لئے زمانہ حال کے ترجمے جو اس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور با محاورہ اور فصیح ہیں مگر اُن کا مفصل حال معلوم نہیں ہے بھاشا میں اوّل شمال مغربی اضلاع میں گلستان کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا جس کی اشاعت کو تقریباً تیس برس گذرے ہونگے۔ اِس ترجمہ کا نام مترجم نے پشپوپ باٹکا (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے۔ اِس کے بعد ہمارے دوست پنڈت مہرچند داس مہاجن اگروال جینی مذہب متوطن قصبہ سونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستان کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے جو ۱۸۸۹ء میں چھپ کے شائع ہو گیا ہے۔ اِس ترجمہ کا نام پشپوپ بن رکھا ہے جو کہ لفظ گلستان کا مرادف ہے پنڈت صاحب نے پندنامہ شیخ یعنی کریما بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ہے۔ جس کا نام شیکشا پتری ہے۔

ترجمہ کے علاوہ گلستان بلکہ بوستان کی بھی بہت سی شرحین اور فرہنگیں لکھی گئیں ہیں۔ جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستان اور ٹیک چند کی بہار بوستان

زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستان کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے جس طرح اہل علم نے مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے کئے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہل تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اِس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے اسی طرح اُمرا نے اُس کے نسخے نہایت خوشخط لکھوا لکھوا کران کو مطلّٰی اور مذہّب کرایا ہے یہاں تک کہ ہمارے مُلک کے رئیسوں نے بھی جو ورش کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اِس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخہ کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپیہ کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ اِن باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلّق نہیں ہے۔ لیکن گلستان کی عام قبولیت پر اِس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے رئیس اس کو اِس قدر عزیز رکھیں۔ گویّا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا پھنسے اور اُن کو محظوظ کر کے اُٹھے۔

گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب۔ اُس کے فقروں کی برجستگی۔ اُس کے الفاظ کی شستگی اُس کے استعارات کی جزالت۔ اُس کی تمثیلات و تشبیہات کی طرفگی اور پھر باوجود اِن تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عُمر عزیز کا ایک معتدبہ حصّہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اُس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچہ گلستان کے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ "برخے از عُمر گرانمایہ بروخرچ کردیم" مگر دیباچہ ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں

اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا۔ وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہوگئی اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستان چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی مگر یہ بالکل غلط ہے جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں۔ کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنّف کے خُون جگر کی چاشنی نہ ہو۔ اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اُسی قدر سمجھنا چاہیئے کہ اُس کی دُرستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔ یورپ میں اکثر نامی مصنّفوں کے مسودے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصّہ میں جو ویزا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنّف ایریسٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنّف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلّفی میں مشہور رہے مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ لارڈ مکالی جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنّف ہے اُس کا ایک مسودہ لندن موزیم میں رکھا ہے اِس میں بھی جا بجا کاٹ پھانس اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ ظاہرا شیخ نے جو گلستان کے دیباچہ میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ گلستان کے لئے جو سرمایہ اُس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا۔ وہ پہلے سے اُس کے پاس نا مرتب موجود تھا۔ جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اُس مرتب کر دیا یہ ترتیب فصلِ بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اُس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہوگئی۔ گلستان اور نیز بوستان کی ترتیب جس سلیقہ سے شیخ نے

کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو اِس کام میں بہت وقت اُٹھانی پڑی ہوگی اُس نے اِن کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اُس پر گزرے ہیں یا اُسکے سامنے پیش آئے۔ اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لئے کسی قدر حکائتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سُنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اس تمام مجموعہ کو گلستان میں آٹھ باب پر اور بوستان میں دس باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اُس کے مناسب حکائتیں درج کی ہیں اور ظاہرا علم اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو بقدر ضرورت اِن میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی۔ جیسے کوئی شخص سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اُس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آجائے اِس ترتیب کی قدر اُس وقت معلوم ہوسکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکائیتوں کو مرتب کرکے گڈ مڈ کردیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجے شیخ نے استخراج کئے ہیں وہ اُن میں درج نہ کئے جائیں اور پھر تمام مجموعۂ حکایت کو جُدا جُدا بابوں پر تقسیم کرایا جائے اور پُوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے جس طرح ہر ایک ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے اِسی طرح ایران میں بھی اوّل شاعری کا ظہور ہوا تھا اور دوسری صدی کے اخیر سے جبکہ اوّل ہی اوّل خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا۔ کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقّی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدّت کے بعد شروع ہو گیا۔ لیکن شیخ کے زمانہ تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرّر نہیں ہوئی

اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرّہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روزمرّہ میں تحریر کرتے تھے۔ چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا۔ اِس میں نہایت بے تکلّفی سے خواص کی معمولی بولچال میں حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ اور بعض ادیب اور فاضل جن پر عربیت غالب تھی اُن کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لُغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراوش کرتے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اُس کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور توُل کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہُوا تھا خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانہ تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی۔ جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ ۵۵۱ھ میں قاضی حمید الدین ابو بکر نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے۔ اُس میں نہایت تکلّف اور تصنّع پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح مقفیٰ اور مسجع لکھی ہے اور جس طرح اِن دونوں کتابوں میں فرضی قصّے وضع کئے گئے ہیں اُسی طرح اُس میں محض خیالی افسانے لکھے ہیں۔ جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار مصنّف کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اِس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لُغات پر بہت عبور تھا۔ اور تجنیس و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قُدرت رکھتا تھا۔

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری

نظر سے گذری ہے۔ جس کا مصنّف قابوسؔ بن سکندر ملقب بہ عنصر المعالی ہے یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں۔ لیکن اِس کے سوا کوئی ندرت یا دلفریبی اُس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی۔

غرضیکہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستان کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اِس روش کا موجد تھا اور اُسی پر اُس کا خاتمہ ہوگیا۔

اُس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی نثّاروں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی۔ یا اپنا فلسف اور تبحّر علمی جتانا یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لبھانا۔ اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اُس نے دونوں کتابوں میں باستثنا چند حکائیتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سُن کر کچھ زیادہ تعجّب ہو۔ وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سُنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی اور ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گذرتی ہیں۔ عام حکائیتیں جو اِن کتابوں میں درج ہیں۔ وہ اِس قبیل کی ہیں۔ کہ مثلاً ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرضدار ظاہر کرکے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کئے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکّار تھا۔ اِس کو کچھ دینا نہ چاہئے۔ فرمایا اگر مکّار تھا

[1] یہ شخص دیار آل زیار میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے جرجان اور گیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے اور ۴۶۲ھ میں وفات پائی ؞

تو نہ اُس کے شر سے بچا اور نہ وہ اوروں کے شر سے بچا۔

یا یہ کہ ایک بادشاہزادہ کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھروں میں سے لعل پانا چاہتا ہے۔ تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔

یا یہ کہ میں چند درویشوں کے ساتھ رُوم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں اُترے اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔

ان سیدھی سادی حکائیتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے۔ اور اُن سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصّہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستان اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ اِن کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا۔ اُس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چھبتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا اُفتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلاویز طور پر بیان کر سکتا تھا۔ جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو۔

تعجب ہے کہ شیخ کی گلستان جو آیندہ نسلوں کے لئے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی ایران میں اُس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا یا یُوں کہئے کہ کسی سے اُس کا تتبع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقّی یا وسعت انتہا کے درجہ کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے بمراتب فائق تر تھا۔ مگر سب کی ہمّت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصود رہی۔

ایران میں سب سے بڑا انشا پرداز فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے۔ جو شیخ کے اخیر زمانہ میں ہوا ہے اُس کی مشہور کتاب تاریخ وصاف سے بیشک اُس کا کمال علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجہ کی استعداد کا آدمی ڈکشنری کھولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر چبھے ۷۱۲ھ ہجری میں جبکہ سلطان محمد اولجائتو خان خدابندہ کے حکم سے آذربیجان میں شہر سلطانیہ بن کر تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی۔ اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی۔ سلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا۔ اسوقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبدالملک اور خواجہ اصیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور فاضل موجود تھے فضل اللہ نے چند دُعائیہ فقرے کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی خاص سلطان کے سُنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کئے سلطان ہر فقرہ کے معنی رشید الدین وغیرہم سے پوچھتا تھا۔ یہ لوگ اُس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے۔ تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا۔ یا شرم سے شرمائے۔ کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا۔ یہ حال تاریخ وصّاف کی عبارت کا ہے اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اِسی بات میں کوشش کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقّتیں پیش آئیں۔ اور اُنکے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات زود فہم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کئے جائیں۔

تین کتابیں میری نظر سے گذری ہیں۔ جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں

ایک مولانا عبدالرحمن جامی کی بہارستان - دوسری مجدالدین خوافیؒ کی خارستان - تیسری جیبیبؒ قاآنی شیرازی کی پریشان سو اوّل ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں - اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو خارستان کا طریقۂ تحریر اکثر جگہ اہل زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے - لیکن جب دونوں کو گلستان کے مقابلہ میں لایا جاتا ہے - تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے - اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک کو دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی - حکائتیں اور روائتیں جو اِن دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستان کی حکائیتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں - اور زیادہ تر مجدالدین خوافی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اُسی طریقہ پر مرتب کئے ہیں مگر شیخ کے حسن بیان اور لطف ادا سے گلستان نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے - ہر چند اس قسم کی ہمشکل اور ہمجنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے - لیکن چند متحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کونسا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلاویز ہے اور کونسا کم اس لئے چند ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں - اِس مقام

ؒ یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا - خواف خراسان میں ایک مشہور بستی ہے - کہتے ہیں کہ خارستان اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی ؒ یہ شخص زمانہ حال کا ایک نہایت مسلّم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہل ایران خاتم الشعرا سمجھتے ہیں اُس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گذرے ٭

پر نقل کی جاتی ہے ؎

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

گلستان - اسکندر را پرسیدند کہ دیار مغرب مشرق را بچہ گرفتی کہ ملوک پیشین را خزائن و عمر و ملک و لشکر بیش از بود و چنیں فتحے میسر نشد گفت بعون خدائے عز و جل ہر مملکتے را کہ گرفتم رعیتش را نیازردم و رسوم خیراتِ گذشتگان باطل نہ کردم و نام بادشاہان جز بہ نکوئی نہ بردم - **بیت**

بزرگش نخوانند اہل خرد ؛ کہ نام بزرگان بزشتی برد

قطعہ

چوں ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد ؛ بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار

نام نیک رفتگان ضائع مکن ؛ تا بماند نام نیکت یادگار

بہارستان - اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی آنچہ یافتی از دولت سلطنت و مملکت با صغر سن و حداثت عہد - گفت باستمالت دشمنان تا از غائلہ دشمنی زمام تافتند و از تعاہد دوستان تا در قاعدۂ دوستی استحکام یافتند -

بیت

بایدت ملک سکندر چون وے از حسن سیر

دشمنان را دوست گردان دوستان را دوست تر

ان دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوق صحیح پر منحصر مگر جس قدر قید بیان میں آسکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے - لیکن اس سے محض گلستان کی فوقیت جتانی مقصود ہے نہ کہ بہارستان کی تنقیض کرنی اوّل "اسکندر را پرسیدند" اور "اسکندر را گفتند" میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے - سوال کے موقعہ پر پرسیدن بہ نسبت گفتن کے زیادہ مناسب ہے دوسرے شیخ کے ہاں خزائن و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار

نہیں ہے۔اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت
دونوں ورنہ صرف لفظِ مملکت حشو ہے اور صغیر سن کے بعد حداثت عہد بھی حشو
ہے تیسرے شیخ کے ہاں بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کمی لشکر
و مُلک و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا۔اور مولانا کے
ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت
اور سلطنت حاصل کی ہے چوتھے سکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اُس میں
ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب ناتمام رہتا اور
جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا" بہ استمالتِ
دشمنان وتعاہد دوستان" اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی
پانچویں شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے۔
وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجہ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔شیخ کا نتیجہ لازمی ہے۔اور
مولانا کا نتیجہ غیر لازمی۔کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور
دوستوں کو زیادہ دوست بنائیگا اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائیگی
اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت
میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون
ہے۔کہ جب تک بیان نہ کیا جاوے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں
کر سکتا۔نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے کیونکہ سلف
کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں
مثمر برکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین اولوالعزم کے ساتھ مخصوص

ہے کیونکہ ملک سکندر کی خواہش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی ؞

گلستان ۔ رازیکہ نہان خواہی باکسے
درمیان منہ اگرچہ دوست باشد کہ مرآن
دوست رانیز دوستان باشند وہمچنین
مسلسل۔ **قطعہ**

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش
باکسے گفتن وگفتن کہ مگوئے
اے سلیم آب زسرِ چشمہ بہ بند
کہ چون پُرشد نتوان بستن جوئے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت
کان سخن بر ملا نشاید گفت

بہارستان ۔ اسرارِ نہان خود را باہیچ
دوستی درمیان منہ زیرا کہ بسیار بود کہ در
دوستی خلل افتد وبدشمنی بدل گردد۔ **قطعہ**

اے پسر سرے کش از دشمن نہفتن لازمست
بہ کہ از افشائے آن با دوستی کم دم زنی
دیدہ بسیار گز سیر سپہر کج نہاد
دوستان دشمن شوند ودوستیہا دشمنی

قطعہ

بر سرّ سر بمہر کہ اُفتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامتِ اظہار آن ترا
مشکل ترا زندامتِ پوشیدہ داشتن

اِس مثال میں بھی گلستان کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ہے
۱۔ شیخ کہتا ہے "رازیکہ نہاں خواہی" یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اُسے کسی سے نہ کہو۔ اور مولانا کہتے ہیں "اسرار نہان خود را" یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو۔ حالانکہ بعضے بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدّت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے
۲۔ شیخ کہتا ہے "باکس درمیان منہ اگرچہ دوست باشد" اور مولانا کہتے ہیں

"بہ ہیچ دوستی درمیان منہ" پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سے راز کہنے کی ممانعت مگر دُوسرا بیان جب تک اِس طرح نہ ہو" با دوست ہم درمیان منہ" تب تک اُس میں تعمیم پیدا نہیں ہوتی۔ ۳۔ شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے۔ کہ اُس کے بھی دوست ہونگے اور اُن دوستوں کے بھی دوست ہوں گے اور یہ سلسلہ اِسی طرح چلا جائیگا پس چپکے ہی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا۔ مولانا نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شاید دوستی میں خلل آجائے اور دوست دشمن ہو جائے اگرچہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ موجہ ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آجانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ ۴۔ شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے بمراتب افضل اور فائق تر ہے۔ پہلی بیت میں اُس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے وہ کہتا ہے ؎

خامُشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش		باکسے گفتن و گفتن کہ مگوے	

یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اُس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے اِس لئے اب اُس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔ پس اِس سے خامشی ہی بہتر ہے۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دلنشین کیا ہے۔ مولانا کے قطعہ میں کوئی خوبی اِس مضمون کے سوا نہیں ہے۔ کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہئے اُسے دوست سے بھی چھپانا چاہئے۔ مگر اُن کے ساتھ لفظ افشا زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ "ازاں دم ترقی" کی جگہ "از افشائے آن دم نزنی" کہا گیا ہے اور قطعہ کا اخیر مصرعہ

بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا
فی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ ۵۔ قطعہ کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے۔ جو
فی الواقعہ سہل و ممتنع ہے یعنی ؎

سخنے در خلا نباید گفت		کان سخن بر ملا نشاید گفت	

یہ وہ کا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو ناگفتنی باتیں
کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخلیے میں گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع
نہیں ہو سکتے حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس مجرّب اور سچے
مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اُس سے زیادہ بیان
کی صفائی ممکن نہیں۔ پھر خلا اور ملا اور درا ور بر کا مقابلہ اور صنعت ذوقافتین اُس کے
علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی "ہر سر بھر کہ
اُفتد بخاطرت آلخ" اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سر بستہ تیرے
خیال یا دل میں گذرے اور مطلب یہ ہے کہ بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو پھر
"بموج بیانش نگاشتن"، کا لفظ" در اظہار آن" کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت
تکلّف ہے۔ پھر اخیر مصرعہ میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ اخفائے راز سے
کبھی ندامت نہیں ہوتی۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں شیخ کے
ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ
بمقابلہ گلستان کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں جیسے حداثِ عہد۔ غائلہ۔ تعاہد۔
بموج بیانش نگاشتن۔ عرامت ؞

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

گلستان- حکیمان دیر دیر خورند و عابدان نیم سیر- وزاہدان تا سدِ رمق- وجوانان تا طبق بر گیرند- وپیران تا عرق کنند- اما قلندران چندان خورند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر سفرہ روزی کس **بیت**

اسیر بند شکم را دو شب نگیرد خواب
شبے زمعدۂ سنگی شبے زد لتنگی

عالم ناپرہیزگار کور مشعلہ دار است
یھدی بہٖ وھو لا یھتدی نے **بیت**

بیفائدہ ہر کہ عمر درباخت
چیزے نخرید و زر بینداخت

خارستان- ہر کہ در گرسنگی طاقت نیارد باید کہ سہ یک شکم را از طعام بر کند و سہ یک دیگر از آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رہا کند- اما صوفیان وقت مامیگویند کہ تو ہمہ شکم را از طعام پُر کن آب خود چیز لطیف ست خود را جائے میکند کہ لطیفان را جائے کم نباشد و نفس را جائے گو مباش- **بیت**

بشنو کہ چہ گفت صوفیِ پرواری
چون سیر شدی چرا غم جان داری

علم با عمل ہمچو طعام با نمک ست
ہر کرا ہر دو ہست حکمتے تمام دارد و
طعام بے نمک را چہ توان کرد- **بیت**

عمل بے علم نا مضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خارستان کی عبارت گلستان کے مقابلہ میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے اسی لئے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں

اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔

پریشان کا مصنّف مرزا حبیب قاآنی کتاب مذکور کے خاتمہ کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اُس کی عُمر تیس برس سے بھی وہ تین برس کم تھی۔ جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے اور شیخ نے گلستان کو سنِ کہولت اور اوائل سنِ شیخوخت میں مرتّب کیا ہے۔ پس اگر قاآنی سے گلستان کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہئے شیخ کے مقابلہ میں ایک نوجوان ناتجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عُمر میں قاآنی سے گلستان کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا۔ کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشی کے سوا حقیقت اور واقفیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا۔ قاآنی نے بھی گلستان کی طرح پریشان کی عبارت دلچسپ اور دلاویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سوا اِس کے تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بیباک نوجوانوں کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیّا کر دیا اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمہ کتاب کے سوا جس میں اُس نے ابنائے ملوک کے لئے پند بپند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں۔ تمام کتاب میں وہ حکائیتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ فحش یا نخیف ہزل پر رکھتا ہے جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے اور طرّہ یہ کہ پھر اُس سے نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشان کا خاتمہ جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے باب ہشتم گلستان کے مقابلہ میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے

تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا۔ جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بیشک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قبیل کے ہیں پند بادشاہ باید بہ سخن چینان اعتماد نکند پند بادشاہ باید دین را توقیر کند و دشمنان دین را تحقیر فرماید پند بادشاہ باید از خدا غافل نماند تا خدائے از و غافل نباشد پند بادشاہان را در نظام ممالک دست دُرافشان بکارست و تیغ سرافشان۔ بیت۔

"تا کہ بدان دوستان شوند فراہم۔ تا کہ بدین دشمنان شوند پریشان" اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حُسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں حقیقت سے دُور جا پڑتا ہے۔ مثلاً پند بادشاہ باید تواضع کند و تکبّر نفرماید کہ تواضع صفتِ اتقیاست و تکبّر صفتِ اشقیا۔ و من گفتہ ام اہل تکبّر را در نطفہ غش ست چو سرکشی صفت آتش ست و شیطان از آتش ست و اہل تواضع را نطفہ پاکست چہ اُفتادگی صفت خاکست و آدم از خاک بود۔ اِس پند کے پہلے حصّے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصّے میں جو اُس نے کچھ ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوستان میں اِس طرح بیان کیا ہے ؎

زخاک آفریدت خداوند پاک — پس اے بندہ اُفتادگی کُن چو خاک
حریص و جہان سوز و سرکش مباش — زخاک آفریدندت آتش مباش
چو گردن کشید آتش ہولناک — بہ بیچارگی تن بینداخت خاک
چو آن سرفرازی نمود ایں کمی — ازان دیو کردند ازیں آدمی

البتہ جو عذر کہ قاآنی نے پریشان کے دیباچے میں کیا ہے اور گلستان کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستان کی قدرشناسی ظاہر ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے احباب کے نہایت جبر سے پریشان کے لکھنے پر قلم اُٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستان کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیئے میں نے کہا۔ بھائی توبہ کر! ہَیں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوّت کا دعویٰ کرکے کذّاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا میں نے مانا کہ جگنو رات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاندنی کی برابری کر سکتا ہے؟ شیخ کی گلستان ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتّی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اِس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جدّ و ہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کر سکتی لیکن اس کو بھی چار و ناچار اُڑنا ہی پڑتا ہے۔

اب ہم چند ایسے فقرے گلستان اور پریشان سے انتخاب کرکے لکھتے ہیں جو متحد المضمون ہیں +

گلستان اور پریشان کا مقابلہ

گلستان۔ اے فرزند دخل آب روانست وخرج آسیاے گردان۔ یعنی خرج فراواں	**پریشان**۔ دخل سرچشمہ الیست و مخارج جوے چندکہ آب سرچشمہ در آنہا جاری است

کردن مسلم کسے راست کہ دخلے معین دارد

قطعہ

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ میگویند ملّاحان سرودے
اگر باران بکوہستان نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

دلا شنک چون سرچشمہ مسدود شود جوئہا خشک شود پس ہر کس آب در جو جاری خواہد سرچشمہ را رعایت کند۔

ایضاً۔ خرج باندازہ دخل باید کرد نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم چہ این معنی نامعقول است کہ با در پیش قدم باشد و باگیر در حیزم عدم باشد۔ **قطعہ**

الا اے آنکہ حاجت ست موجود ۔ بکارت می نیاید دخل معدوم
شنید ستی کسے از بہر جولان ۔ نشیند بر فراز اسپ موہوم

اس مثال میں گلستان سے صرف ایک عبارت اور پریشان کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان قاآنی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ ہے لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں۔ اُن کا بیان کرنا اوّل تو مشکل ہے دوسرے یہ اُمید نہیں کہ ناظرین اُس کو غور سے دیکھیں گے اسی لئے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین مقتضائے مقام ہے۔ ایک تو اظہار شفقت جو ناصح کے لئے ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتانا کہ نوجوان بھی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل و خرج کی تشبیہ آب روان اور پنچکی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر نرالی ہے اسی قدر ٹھیک بھی ہے پن چکی بھی بدون آب روان کے نہیں چلتی اور خرچ بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا۔

پن چکّی بھی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے۔ تو اُسکی
گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے خرچ بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ
سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائدار ہوتا ہے۔ پھر اِس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے
تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لئے لکھا ہے شیخ نے اِن مختصر اور جامع لفظوں میں
ادا کیا ہے "یعنی خرج فراوان کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد"
اِس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرچ کا مآل ہر شخص
کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اُس مقولے کو ملّاحوں کی طرف منسوب کر کے
یہ جتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملّاحی گیتوں
میں گائی جاتی ہے قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ
دی ہے تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے مگر یہ شیخ کی اُس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اُس نے
قطعے میں بیان کی ہے لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی۔ اِس لئے
شیخ نے اُس کو ملّاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔
پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سرچشمے کے بند ہوتے ہی ندیاں
خُشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر
مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا شیخ نے
لکھا ہے پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساک باران
کی طرف مستبند کیا ہے اور یہ کہا ہے "واگر باران کوہستان نبارد" اور قاآنی کہتا
ہے کہ جو شخص ندی جاری رکھنی چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے یعنی اُس کو بند نہ
ہونے دے حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے پھر قاآنی نے تمثیل سے

نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رکھنا چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے۔ اگرچہ مطلب اِس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن اِس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اُس کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرچ جاری رکھنا چاہے اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہئے کیونکہ تمثیل اِس مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے نہ اِس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رکھنا چاہو تو سرچشمے کی خبر رکھو۔ دوسری عبارت کو قاآنی نے اِس جملے سے شروع کیا ہے "خرج باندازہ دخل باید کرد" اِس کے بعد وہ کہتا ہے "نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم"۔ یہ دُوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے کیونکہ سُنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن وعید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا۔ ورنہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہئے تھا "نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار" یا "نہ آنکہ دخل پنج باشد و خرج دہ" یا اور اِسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ہو سکتا ہے۔ اِس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ہے کیونکہ دخل موہوم کی اُمید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے۔ تمام تاجر اور کاشتکار اور مدبّران ملک دخل موہوم ہی کے بھروسے پر لکھوکھا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر ایسے خرچ کو جو دخل موہوم کی اُمید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ہو سکتا لیکن دخل موہوم کی اُمید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ہزاروں آدمی خرچ کر سکتے اور کرتے ہیں۔

گلستان۔ خشم بیش از حد گرفتن وحشت آورد لطفِ بیوقت ہیبت ببرد نہ چندان درشتی کن کہ از تو سیر گردند نہ چندان نرمی کہ بر تو دلیر۔ ابیات

درشتی و نرمی بہم در بہ ست * چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہست

درشتی نگیرد خردمند پیش * نہ ستی کہ نازل کند قدر خویش

نظم

جوانے بپدر گفت اے خردمند * مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند

بگفتا نیکمردی کن نہ چندان * کہ گردد چیرہ گرگ تیز دندان

پریشان۔ کسانیکہ ظرافت و شوخی بسیار کنند یا لغایت رقیق القلب و وسیع الخلق باشند سرداری وسالاری لشکر را نشایند۔ چہ این صفت موجب جسارتِ لشکریان شود و گاہ باشد کہ ہرچہ گوید بہ ظرافت و شوخی حمل کنند و نیز اندک مہربانی و وسعتِ خلق لازم ست کہ لشکریان را بیم خستن و بستن نباشد و در نیست کہ از بیم چشم و گوش حقوقِ بادشاہ فراموش کنند و در مخالفت ہمزبان شوند و در وقت کار سستی کنند تا کار فاسد شود۔

مثنوی

کسے را کہ شد حکمران بر سپاہ * دو خصلت ہمیشہ بباید نگاہ

عتابے نہان اندر و صد خطاب * خطابے نہان اندر و صد عتاب

بہر نوش و نیش با جان گداز * بہر نیش و نوشہا دلنواز

بیکدست شمشیر زہر آبدار * بیکدست دریای گوہر نثار

اس مثال میں گلستان اور پریشان کے مضمون میں کسی قدر فرق ہے۔ گلستان میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور پریشان میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے اس لئے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ نفس مضمون متحد ہے اسواسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معناً قاآنی کے بیان سے

براتب فائق تر ہے۔ اوّل تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے۔ جو قاآنی کے فقروں میں نہیں ہے نثر میں ایسا تناسب بشرطیکہ معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے پرلے درجے کا کمال انشاپردازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رُتبے کی شاعری ہے۔ شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو اُن سے اور زیادہ رونق ہو گئی ہے۔ یعنی خشم اور لطف۔ بیش از حد اور بیوقت۔ وحشت اور ہیبت۔ آرد اور ببرد۔ درشتی۔ اور نرمی کو جو فصاد کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا اشعار بنا لینا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتن سے مستفاد ہوتا ہے اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ عقلمند ایسا نہیں کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کہ نیکی بے محل کرنی نہیں چاہئے کیسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چندان کا قافیہ متناسب اور ہموزن لانے کے لئے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ قاآنی کی نثر میں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی بات جو قابل ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے پریشان کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر

متوجّہ ہوتے ہیں اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اُردو کی تحریر و تقریر میں جسقدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے۔ اُن میں سے کسی قدر یہاں نقل کئے جاتے ہیں ۱۔ ہر عیب کہ سُلطان بہ پسندد ہُنر ست۔ ۲۔ ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت۔ ۳۔ حاجت مشاطہ نیست روی دلارام را۔ ۴۔ ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر۔ ۵۔ ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید۔ ۶۔ دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔ ۷۔ سر چشمہ شاید گرفتن بمیل ٭ چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل۔ ۸۔ پرتو نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بدست۔ ۹۔ افعی را کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کار خردمندان نیست۔ ۱۰۔ پسر نوح بابداں بنشست ٭ خاندان نبوتش گم شد۔ ۱۱۔ دشمن نتوان حقیر و بیچارہ شمرد۔ ۱۲۔ عاقبت گرگ زادہ گرگ شود۔ ۱۳۔ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس۔ ۱۴۔ تونگری بہ دل ست نہ بمال۔ و بزرگی بعقل ست نہ بسال۔ ۱۵۔ دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست۔ ۱۶۔ حسود را چکنم کو زخود برنج درست۔ ۱۷۔ قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔ ۱۸۔ آنانکہ غنی ترند محتاج ترند۔ ۱۹۔ چو عضوے بدرد آورد روزگار۔ دگر عضوہا را نماند قرار۔ ۲۰۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ ۲۱۔ گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند۔ ۲۲۔ ہر کجا چشمۂ بود شیریں ٭ مردم و مُرغ و مور گرد آیند۔ ۲۳۔ راستی موجب رضائے خداست ٭ کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست۔ ۲۴۔ آنرا کہ حساب پاکست از محاسبہ چہ باک۔ ۲۵۔ تو پاک باش برادر مدار از کس باک۔ زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ۔ ۲۶۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مُردہ شود

۲۷- بہ دریا در منافع بیشمار ست ٭ دگر خواہی سلامت بر کنار ست - ۲۸- دوست آن باشد کہ گیرد دستِ دوست ٭ در پریشان حالی و درماندگی- ۲۹- در میر و وزیر و سلطان را بے وسیلت مگرو پیرامن- سگ و دربان چو یافتند غریب- این گریبان گرفت وآن دامن- ۳۰- خدائے راست مسلم بزرگی والطاف ٭ کہ ظلم بیند و نان برقرار میدارد- ۳۱- بنیاد ظلم اوّل در جہان اندک بود ہر کہ آمد بران مزید کرد تا بدین غایت رسید- ۳۲- ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد ٭ ساعدِ سیمین خود را رنجہ کرد- ۳۳- چو کردی با کلوخ انداز پیکار ٭ سر خود را بنادانی شکستی- چو سنگ انداختی بر روے دشمن ٭ حذر کن کاندر آماجش نشستی ۳۴- کس نیاموخت علم تیر از من ٭ کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد - ۳۵- دریاب کنون کہ نعمتت ہست بدست ٭ کین دولت و ملک میرود دست بدست - ۳۶- گر وزیر از خدا بترسیدے ٭ ہمچنان کز ملک ملک بودے- ۳۷- بر گردن او بماند و بر ما بگذشت ۳۸- اگر شہ روز را گوید شب است این ٭ بباید گفت اینک ماہ و پروین- ۳۹- جہاندیدہ بسیار گوید دروغ - ۴۰- چو کارے بے فضولِ من برآید ٭ مرا در وے سخن گفتن نشاید- ۴۱- اگر روزی بدانش برفزودے ٭ ز نادان تنگ تر روزی نبودے- ۴۲- محتسب را درون خانہ چہ کار- ۴۳- ہر کہ عیبِ دگران پیش تو آورد و شمرد ٭ بیگمان عیب تو پیش دگران خواہد برد- ۴۴- یار شاطر نہ بارِ خاطر ۴۵- چو از قومے یکے بیدانشی کرد ٭ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را - ۴۶- من آنم کہ من دانم- ۴۷- گہے بر طارم اعلیٰ نشینم- گہے بر پشت پائے خود نہ بینم ۴۸- فہم سخن گر نکند مستمع قوتِ طبع از متکلّم مجوی- ۴۹- خانہ دوستان بروب و در دشمنان مکوب ۵۰- درویش صفت باش و کلاہ تتری دار- ۵۱- نیک باشی و بدت گوید خلق

بہ کہ بد باشی ونیکت گویند - ۵۲ - اگر دُنیا نباشد دردمندیم ٭ وگر باشد بمہرش پائے بندیم

۵۳ - درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست - ۵۴ - پائے در زنجیر پیش دوستان

بہ کہ با بیگانگان در بوستان - ۵۵ - زن بد در سرائے مرد نکو ٭ ہمدرین عالم ست

دوزخ او - ۵۶ - کوفتہ را نانِ تہی کوفتہ است - ۵۷ - او خویشتن گم است کرا رہبری کند

۵۸ - باطل است انچہ مدعی گوید - ۵۹ - مرد باید کہ گیرد اندر گوش ٭ در نوشتہ ست

پند بر دیوار - ۶۰ - خاک شو پیش از انکہ خاک شوی - ۶۱ - اگر خاکی نباشد آدمی نیست

۶۲ - ہمراہ اگر شتاب کند ہمرہ تو نیست - ۶۳ - خوے بد در طبیعتے کہ نشست

نرود جز بوقت مرگ از دست - ۶۴ - حقّا کہ با عقوبت دوزخ برابرست ٭ رفتن

بپاے مردی ہمسایہ در بہشت - ۶۵ - خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست

تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست - ۶۶ - نہ چندان بخور کز دہانت بر آید ٭ نہ

چندانکہ از ضعف جانت بر آید - ۶۷ - عطاے او بہ لقاے او بخشیدم - ۶۸ -

ہر کہ نان از عملِ خویش خورد - منّتِ حاتم طائی نبرد - ۶۹ - گربۂ مسکین اگر پر داشتے

تخم گنجشک از جہان بر داشتے - ۷۰ - مور ہماں بہ کہ نباشد پرش - ۷۱ - گفت چشم

تنگ دُنیا دار را ٭ یا قناعت پر کند یا خاکِ گور - ۷۲ - منعم بکوہ و دشت و بیابان

غریب نیست - ۷۳ - شاہد آنجا کہ رود عزّت و حُرمت بیند ٭ در برانند بقہرش

پدر و مادر خویش - ۷۴ - بہ از روے زیباست آواز خوش - کہ این حظِّ نفس ست

وآن قوتِ روح - ۷۵ - رزق ہر چند بیگماں برسد ٭ شرطِ عقل ست جستن از درہا -

۷۶ - بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند - ۷۷ - مورچگان را چو بود اتّفاق ٭ شیر ژیان را

بدرانند پوست - ۷۸ - صیّاد نہ ہر بار شکارے ببرد ٭ باشد کہ یکے روز پلنگش بدرد

۷۹-گاہ باشد کہ کودکِ نادان۔ بغلط بر ہدف زند تیرے۔ ۸۰-گردنِ بے طمع بلند بود۔ ۸۱-این شکم بے ہنر پیچ پیچ۔ صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ۔ ۸۲-یکے نقصانِ مایہ و دوم شماتتِ ہمسایہ۔ ۸۳-اگر از ہر دو جانب جاہلانند * اگر زنجیر باشد بگسلانند۔ ۸۴-مرا بخیر تو اُمید نیست بد مرسان۔ ۸۵-تو بر اوجِ فلک چہ دانی چیست * چون ندانی کہ در سرائے تو کیست۔ ۸۶-گر تو قرآن بدین نمط خوانی * ببری رونق مسلمانی۔ ۸۷-چشم بداندیش کہ برکندہ باد * عیب نماید ہنرش در نظر۔ ۸۸-نکوئی با بدان کردن چنانست * کہ بد کردن بجائے نیکمردان۔ ۸۹-سرِ مار ندارے سرِ خویش گیر۔ ۹۰-ناز بران کن کہ خریدارِ تست۔ ۹۱-خطائے بزرگان گرفتن خطاست ۹۲-چون مجبط شد اعتدال مزاج * نہ عزیمت اثر کند نہ علاج۔ ۹۳-زنِ جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند بہ کہ پیرے۔ ۹۴-تو بجائے پدر چہ کردی خیر * تا ہمان چشم داری از پسرت۔ ۹۵-اسپ تازی دو تگ رود بشتاب * اُشتر آہستہ میرود شب و روز ۹۶-خرِ عیسیٰؑ اگر بمکہ رود * چون بیاید ہنوز خر باشد۔ ۹۷-میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ ۹۸-اگر صد عیب دارد مردِ درویش۔ رفیقانش یکے از صد ندانند * وگر یک ناپسند آید ز سلطان * ز اقلیمے بہ اقلیمے رسانند۔ ۹۹-ہر کہ در خردیش ادب نکنند در بزرگی فلاح از و برخاست۔ ۱۰۰-ہر آن طفل کو جورِ آموزگار * نہ بیند جفا بیند از روزگار ۱۰۱-جورِ اُستاد بہ ز مہرِ پدر۔ ۱۰۲-چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن۔ ۱۰۳-کرا یمانرا بدست اندر درم نیست * خداوندانِ نعمت را کرم نیست۔ ۱۰۴-پراگندہ روزی پراگندہ دل * خداوندِ روزی بحق مشتغل۔ ۱۰۵-سگے را گر کلوخے بر سر آید * ز شادی بر جہد کاین اُستخوان ست۔ دگر نعشے دو کس بر دوش گیرند * لئیم الطبع پندارد کہ خوان ست

۱۰۶- ہر جا کہ گُل ست خارست - ۱۰۷- منّت منہ کہ خدمت سلطان ہمے کنم ٭ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت - ۱۰۸- نہ محقّق بود نہ دانشمند ٭ چارپائے بروکتابے چند - ۱۰۹- پیش دیوار آنچہ گوئی ہوشدار ٭ تا نباشد درپس دیوار گوش - ۱۱۰- ہمہ کس عقل خود بہ کمال نماید و فرزندِ خود بجمال - ۱۱۱- گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد ٭ بخود گمان نبرد ہیچکس کہ نادانم - ۱۱۲- کہ خبث نفس نگردد بسالہا معلوم - ۱۱۳- درشتی و نرمی بہم در بہ است ٭ چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ است - ۱۱۴- مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید - ۱۱۵- اندک اندک شود بہم بسیار - ۱۱۶- کہ بسیار خور است بسیار خوار - ۱۱۷- بر رسولان بلاغ باشد و بس - ۱۱۸- کہن جامۂ خویش آراستن ٭ بہ از جامۂ عاریت خواستن ٭

یہ تمام مقولے جو نقل کئے گئے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں - جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کئے جاتے ہیں - مگر تقریباً اسی قدر فقرے اور اشعار گلستان میں ایسے اور بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کئے گئے - یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دُنیا میں جہاں جہاں گلستان اور بوستان شائع ہوئی ہیں - وہاں زیادہ تر اُن کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلّم میں پایا جاتا ہے - اور اسی لئے چھ سَو برس سے شیخ کے دونوں کارنامے برابر بازیچۂ طفلان اور دستخوش کودکان رہے ہیں - ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اُس نے ان کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں - لیکن چونکہ بچّوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لئے کچھ کچھ فقرے یا اشعار اُن کو یاد رہ جاتے ہیں

پس جس قدر گلستان اور بوستان کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوک زبان ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغر سن کے لذّت یاب ہو چکے ہیں۔ ورنہ اگر یہ کتابیں بھی شکسپیر کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بُوڑھے اور جوان سب لوگ اُن کو دیکھا کرتے تو مَیں اُمید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصّہ اور اُس سے کسی قدر کم بوستان کے اشعار جمہور کی زبان پر اِسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کیونکہ اِن دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اِس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہُوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیّت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں۔ جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیّت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے

یہاں ہم گلستان کے متعلّق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اُسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستان اور اُس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اُسی طرح جاری ہے جیسے گلستان کی۔ مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا موثر اور پُر جوش اُس کی قلم سے تراوش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا۔ لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے۔

اسی طرح اخلاق نصیحت و پند۔ عشق و جوانی۔ ظرافت و مزاح زہد و ریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف و زلیخا اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہُوا ہے۔ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے۔ یہ قصّہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ مَیں اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں" اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفاہانی کی جنگ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے۔ جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت کا انکار نہیں ہو سکتا لیکن شاہنامے کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جمنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں الف و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مرچ جس قدر عام ہندوستانیوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے اُسی قدر اکثر غیرمُلک والوں کو خلاف عادت ہونے کے سبب نامرغوب ہے۔ اکثر عطر ہم کو خوشگوار اور غیرمُلک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں اسی طرح لطفِ شعر جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر الف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دبیر کے مرثیے جس پیرائے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا

مشکل ہے یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلوار کی اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں لکھے جائیں ۔ کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی تعلّی اور قومیّت اوروں پر ظاہر ہو ۔ یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدّس میں لکھا جائے اور مسدّس اُنہیں بحروں میں سے کسی بحر میں ہو جو انیس و دبیر نے اختیار کی ہیں ۔ پس جن خاصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہُوا ہے اُن کے بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی ۔ ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو عربی الفاظ سے پاک ہو رزم لکھی جائے اور بے شمار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرّف کیا ہے اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کئے ہیں کبھی کبھی قصداً اسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامے میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہُوا ہے اشعار میں بہ تکلّف داخل کئے جائیں ۔ پس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شیخ کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا ۔ فردوسی نے بھی یہی گُر اختیار کیا تھا ۔ جس سے اُس کی مثنوی مقبول ہوئی ۔ دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتاسپ اور ارجاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آ چکی تھی ۔ جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعتہً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیقی نے اختیار کی تھی ۔ چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے ۔ دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا یہاں تک کہ جو لوگ اس حال سے واقف نہیں ہیں ۔ وہ اُس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیّت میں تقریباً متساوی الاقدام ہیں شاہنامہ ۔ سکندر نامہ ۔ مثنوی معنوی ۔ اور بوستان ۔ شاہنامے اور مثنوی معنوی کو

سکندر نامے اور بوستان سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بیساختہ
مشق کو اُس کے بنائے ہوئے اور مرتب کئے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے۔ قطعہ
اگرچہ رُخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت
بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزا میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور
تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر مشق میں بہت سی کششیں اور
دوائر وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود
کوشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے یہی سبب ہے
کہ خوشنویس لوگ اگلے اُستادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے
ہیں۔ فردوسیؒ اور مولانا رومؒ نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور
سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانٹ چھانٹ نہیں کی مگر باوجود
اس کے صدہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ کہ
تکلّف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے۔

بوستان اور سکندر نامہ صرف اِس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح و تہذیب
اور زحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعری کا پورا پورا
حق ادا کیا گیا ہے۔ شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے انداز
بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ۔ زور بیان۔ شوکتِ
الفاظ۔ طرفگی استعارات۔ تنوع تمثیلات۔ ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا
کرنا۔ ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اِسی طرح کی
اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اِس کے بوستان میں نہایت سادگی۔ الفاظ

کی نرمی اور گھلاوٹ۔ ترکیبوں کا سلجھاؤ۔ بیان کی صفائی۔ عبارت کی دلنشینی۔ خیالات کی ہمواری۔ مبالغہ میں اعتدال۔ ماخذ میں سہولیت۔ حسن ترتیب۔ لطف ادا۔ تمثیلات کی برجستگی۔ استعارات کی لطافت کنایات کی شوخی۔ باوجود صنعت شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔

مثلاً اِس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے۔ مولانا نظامی سکندرنامے میں اِس طرح ادا کرتے ہیں ؎

فلک در بلندی زمین در مغاک	یکے طشت خون شد یکے طشت خاک
بنشتہ برین ہر دو آلودہ طشت	زخونِ سیاوش بسے سرنوشت
زمین گر بضاعت برون آورد	ہمہ خاک در زیر خون آورد

یہی مطلب سکندرنامے میں دوسری جگہ اِس طرح بیان ہُوا ہے ؎

کہ داند کہ این وخمہ دام دود	چہ تاریخہا دار داز نیک و بد
چہ نیرنگ با نجبردان ساختہ است	چہ گردن کشان را سر انداختہ است

شیخ نے اِسی مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے ؎

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک	بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار گر مردی آہستہ تر	کہ چشم و بناگوش و رویست و سر

یہی مطلب بوستان میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہُوا ہے ؎

دریں باغ سروے نیامد بلند	کہ بادِ اجل بیخش از بن بلند
عجب نیست بر خاک اگر گُل شگفت	کہ این گل اندام در خاک خفت

قناعت کی ترغیب سکندرنامے میں اِس طرح دی ہے ؎

تو نیز ار نہی بار گردن زدوش	زگردن کشان بر نیاری خروش
چو دریا بسرمایۂ خویش باش	ہم از بودِ خود سود و خود بر تراش
بھمانیِ خویش تا روز مرگ	درختے شو از خویشتن ساز برگ
چو پیلہ ز برگِ کساں خورد گاز	ہمہ تن شد انگشت وقتے کرد باز

بوستان میں یہی مطلب اِس طرح ادا ہُوا ہے ؎

شنیدی کہ در روزگار قدیم	شدے سنگ بر دستِ ابدال سیم
پنداری این قول معقول نیست	چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست
چو طفل اندرون دارد از حرص پاک	چہ مشتِ زرش پیش و چہ مشتِ خاک
خبر دہ بدرویشِ سلطان پرست	کہ سلطان ز درویش مسکین ترست
گدا را کند یک درم سیم سیر	فریدوں بملکِ عجم نیم سیر
گدائے کہ بر خاطرش بند نیست	بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست
بخسپند خوش روستائی و جفت	بذوقے کہ سلطان در ایوان نخفت

مآل اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامے میں اِس طرح کی گئی ہے ؎

میفگن گول گرچہ عار آیدت	کہ ہنگام سر بکار آیدت
خرے بر گریوزہ سختی بُرد	کہ از کاہلی جلّ با خود نبرد

یہی مضمون بوستان میں اِس طرح ادا کیا گیا ہے ؎

بہ دختر چہ خوش گفت بانوی دہ	کہ روزِ نوا برگِ سختی بنہ
ہمہ وقت پردار مشک و سبوے	کہ پیوستہ در دہ روان نیست جوے

سکندر نامے میں عہد شباب پر تحسر اس طرح کیا گیا ہے ؎

جوانی شد و زندگانی بماند	جهان گو ممان چون جوانی نماند
جوانی بود خوبیِ آدمی	چو خوبی رود کے بود خرّمی
چو پے سست و بوسیده شد استخوان	دگر قصّهٔ خوبروئی مخوان
غرور جوانی چو از سر گذشت	زگستاخ کاری فروشوی دست
بهی چهرهٔ باغ چندان بود	که شمشاد با لاله خندان بود
چو بادِ خزانی در افتد بباغ	زمانه دهد جائے بلبل به زاغ
بود برگ ریزان چو شاخ بلند	دلِ باغبان زان شود دردمند
ریاحین ز بستان شود ناپدید	در باغ را کس نجوید کلید
بنال اے کهن بلبل سال خورد	که رخسارهٔ سرخ گل گشت زرد
دو تا شد سهی سروِ آراسته	کدیور شد از باغ برخاسته
چو تاریخ پنجه در آمد بسال	دگرگونه شد بر شتابنده حال
سر از بارسنگی در آمد بسنگ	جمازه به تنگ آمد از راهِ تنگ
فرو ماند دستم ز مے خواستن	گران گشت پایم ز برخاستن
تنم گونهٔ لاجوردی گرفت	گلم سرخی انداخت زردی گرفت
هیونِ رونده زره ماند باز	ببالین گه آمد سرم را نیاز
همانِ یوز چوگانیِ بادپایے	بصد زخم چوگان نه جنبد ز جایے
طرب را ز میخانه گم شد کلید	نشان پشیمانی آمد پدید

بوستان میں یہی مضمون ایک حکایت کی ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے ؎

چو بادِ صبا بر گلستان وزد	چمیدن درختِ جوان را سزد

چمن تا جوان ست و سر سبز و خید — شکسته شود چون به زردی رسید
بهاران که بار آورد بید مشک — بریزد درختِ کهن برگ خشک
نه زیبد مرا با جوانان چمید — که بر عارضم صبح پیری دمید
بقیدا اندرم جره بازے که بود — دمادم سر رشته خواهد ربود
شمار است نوبت برین خوان نشست — که ما از تنعم بشستیم دست
چو بر سر نشست از بزرگی غبار — دگر چشمِ عیش جوانی مدار
مرا برف بارید بر پر زاغ — نشاید چو بُلبل تماشاے باغ
کند جلوه طاؤس صاحب جمال — چه میخواهی از باز برکنده بال
مرا غله نیک آمد اندر درو — شمارا اکنوں میدمد سبزه نو
گلستانِ مارا طراوت گذشت — که گلدسته بندد چو پژمرده گشت
مرا تکیه جانِ پدر بر عصاست — دگر تکیه بر زندگانی خطاست
مسلم جوان راست بر پاے جست — که پیران براستعانت بدست
گُل سُرخ رویم نگر زرّ ناب — فرو رفت چون زرد شد آفتاب
هوس پختن از کودکِ ناتمام — چنان زشت نبود که از پیر خام
مرا مے بباید چو طفلاں گریست — نه شرم گناهان - نه طفلانه زیست
نکو گفت لقمان که نا زیستن — به از سالها بر خطا زیستن
هم از بامدادان در کلبه بست — به از سود و سرمایه دادن زدست
جوان تا رساند سیاهی بنور — بَرَد پیر مسکین سپیدی بگور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ

سہل الماخذ ہوتے ہیں۔ وہ معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے۔ جو ہمیشہ خاص و عام کے مشاہدے میں آتی ہیں۔ بخلاف مولانا نظامیؒ کے کہ اُن کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں۔

شیخ نے جو شاطرِ صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے اگرچہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسیؒ کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامیؒ کی رزم سے جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے چند شعر اس حکایت کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اِس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

بوستان	سکندر نامہ
دو لشکر بہم بر زدند از کمین	دو لشکر چو مور و ملخ تاختند
تو گفتی زدند آسمان بر زمین	نبردِ جہاں در جہان ساختند
ز باریدنِ تیر ہمچون تگرگ	بشمشیرِ پولاد و تیرِ خدنگ
بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ	گذرگاہ بر مور کردند تنگ
بصید ہزبرانِ پُرخاش ساز	کمند اژدہائے مسلسل شکنج
کمند اژدہائے دہن کردہ باز	دہن باز کردہ بتاراج گنج
زمین آسمان شد ز گرد کبود	زمین کو بساطے بُد آراستہ
چو انجم درو برق شمشیر و خود	غبارے شد از جائے برخاستہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختیم	برانگیخت رزمے چو بارندہ میغ
چو باران پلارک فرو ریختیم	نگرگش ز پیکان و باران ز تیغ

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے۔

شیخ علی حزین نے جس کو ہندوستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں۔ بیس۲۰ بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے بوستان کی طرز میں لکھی ہے۔ اور اپنی عادت کے موافق اُس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں ؎

سخن سنج گرہست ہشیار مغز		کند قوتِ جان این گہرہائے فقر
ازین نامہ گردوں پُر آوازہ شد		روانِ سخن گستران تازہ شد
نوائے کہ این خامہ بنیاد کرد		دلِ طوسی رودکی شاد کرد
بگوشِ نظامی اگر میرسید	ق	سرودے ازین خسروانی نشید
بہ تعظیم من رُخ نہادی بخاک		کہ احسنت اے نیّر تابناک
وگر سعدی شہد پرورادا	ق	شنیدے ز صورِ نے من نوا
سماعش زسر عقل بردے وہوش		زبان مہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزین نے اپنے نزدیک اِس مثنوی میں بوستان کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اُس کو اپنے لئے ایک سرمایۂ نازش سمجھتا تھا۔ سوانح عمری میں اِسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ "بسیارے از مطالب عالیہ و سخنان دلپذیر در آن کتاب بسلک نظم در آمد" مگر دونوں کتابوں یعنی بوستان اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں۔ ایک

جاندار دوسری بیجان - لفظ اچھے - بیان اچھا - مطالب عمدہ - یہ سب کچھ سہی - مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے - جو بوستان کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے - چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے - قحط کا بیان ایک جگہ بوستان میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتّفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے - ہم دونوں کے اشعار اِس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرزِ بیان اور طریقۂ ادا میں ہے اُس کو بھی کسی قدر بیان کرینگے ؛

	بوستان		خرابات
۱	چنان قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کردند عشق	۱	شنیدم کہ در عہد بہرام گور نمود از قضا قحط سالے ظہور
۲	چنان آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر نکردند زرع و نخیل	۲	چو صحرائے محشر زمین تف گرفت بہ دریوزۂ آسمان کف گرفت
۳	بخوشید سرچشمہائے قدیم نماند آب جز آبِ چشمِ یتیم	۳	سحاب سیہ دل نشد مہربان بحال لب تشنۂ خاکیان
۴	نبودے بجز آہِ بیوہ زنے اگر بر شدے دودے از روزنے	۴	بخیلی نمود ابر بر کائنات بمہدِ زمین سوخت طفلِ نبات
۵	چو درویش بے برگ دیدم درخت قوی بازوان سُست و درماندہ سخت	۵	ز خشکی در اندامِ خاک دوتوہ عروق شجر شد چو رگہای کوہ
۶	نہ بر کوہ سبزی نہ در باغ شخ ملخ بوستان خورد و مردم ملخ		ز تابِ فروزندہ مہر بلند زمین مجمر و دانہ بودش سپند

۷ بطے چو پستان بے شیر شد
زخشکی چو پیکان گلو گیر شد

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعے میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے۔ اِس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔
قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اِس ایک مصرعے میں ہوئی ہے" کہ یاران فراموش کردند عشق"۔ سہل و ممتنع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے۔ وہ اِسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنّف سے بھی ویسا بیان نہ ہو سکے۔ اِس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب اُن سب سے علیحدہ ہے قحط کی سختی ہمیشہ اِس طرح بیان کی جاتی ہے" ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے عزیز ہو گئی۔ آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے۔ ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا۔ لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔ غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلّہ کی گرانی۔ پانی کی نایابی۔ بھوک کی تکلیف۔ اور اور اِسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے بلیغ ہے۔ اِس اسلوب سے اُس کو یہ جتانا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی۔ باوجود اِس کے لوگ اُس کو بھول گئے تھے۔ اور یاران کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنّف بھی اُسی عشّاق کے جرگے میں تھا۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینہ نہ برسا تھا۔ مگر اُس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تیسرے شعر میں پانی

کا نایاب ہونا۔ اور پھر یتیم کے آنسو کو اُس سے مستثنیٰ کرنا۔ چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن سے باورچی خانہ کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اُس سے رانڈوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا۔ پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا۔ باوجود اِن تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا۔ درختوں کا سرسبز نہ ہونا۔ چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا۔ یتیموں کا رونا۔ گھروں میں کھانا نہ پکنا۔ بے وارث رانڈوں کے آہ و نالے۔ درختوں کا بے برگ و بار۔ اور غریبوں کا بے سروسامان ہونا۔ پہلوانوں اور زبردستوں کا درماندہ ہونا۔ پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور ہریاول کا نہ رہنا۔ ٹڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا ٹڈیوں کو کھانا یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر کم و بیش ظہور میں آتی ہیں۔

حزین نے باوجود اِس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے بوستان سے پانسو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھڑک اُٹھے۔

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے اُس میں کوئی خوبی قابل ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں زمین تفتہ کو صحرائے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الشئے بالمجہول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دُنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے

قاصر ہے۔ صحرائے محشر اور تمام اعتقادیات خود تمثیل کے محتاج ہیں اُن پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا شعر بوستان کے اُس شعر سے ماخوذ ہے۔ جو ذوالنون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے ؎

خبر شد به مدین پس از روز بیست	که ابر سیه دل برایشان گریست

مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے ترحم اور برسنا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور حزین نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اِس شعر سے ماخوذ ہے ؎

چنان آسمان بر زمین شد بخیل	که لب تر نکردند زرع و نخیل

مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت ناک ہے۔ بہ نسبت اِس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جاوے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت عمدہ مگر پہلا مصرعہ تکلّف سے خالی نہیں۔ شعر کا مطلب صرف اِس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں۔ پس اندام اور دو توہ کے لفظ کو افادہ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اس پر ڈالا جاتا تھا وہ سپند کا حکم رکھتا تھا۔ پس فروزندہ اور باز جو دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں اُنھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندہ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ

مہر بلند کہنے سے اُس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلاف عادت اور خلاف مقتضائے مقام ہے۔ نہ قحط کا یہ خاصّہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اِس بات کی دلیل ہے۔ کہ قحط کی شدّت ہو رہی ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اِس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی حزین پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور بوستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا مد نظر ہے کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزین پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلہ میں لائی جاتی ہے جو اُس سے بمراتب افضل اور فائق ہو تو اُس میں بیسیوں فروگذاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں اگر خرابات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتّفاق سے ایک مضمون کی حکائتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزین کے بیان میں چون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامتہ الورود ہیں۔

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں۔ اور جن کو اُن کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے۔

مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستان سے اور کہیں صرف بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اِن کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سرتاپا اخلاق اور تہذیب نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک ان کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواعظ کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان ہیں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو۔ مگر کوئی کتاب اِن دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی۔ اِس سے ظاہر ہے کہ قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حسن بیان اور لطفِ ادا پر ہے نہ کہ نفس مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیّت میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے جو محاسن اِن کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں۔ وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسن معنی اور اسلوب بیان سے متعلّق ہونگے۔

۱۔ سب سے زیادہ تعجّب انگیز بات اِن دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ اِن کتابوں میں اِس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانہ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو۔ اور یہ امر ایسی پُرانی کتابوں میں جن کے زمانہ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گذر چکے ہیں کچھ کم تعجّب انگیز نہیں ہے۔

مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے اِن کتابوں میں اتنا کم ہے۔ جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں ہیچ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور باموا ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے ؎

میان دو کس دشمنی بود و جنگ	سر از کبر بر یک دگر چون پلنگ

زدیدار ہم تا بحد ے رمان	کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسمان

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے۔ کہ جب کبھی راہ میں دوچار ہو جاتے تھے۔ تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے۔ اور اُس وقت کمال نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اُس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے۔ کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اِس طرح سے کرتے ہیں۔ مالدارے راشنیدم کہ بہ بخل چنان معروف بود کہ حاتم طائی بہ سخاوت۔ ظاہر حالش بہ نعمت دُنیا آراستہ و خسّتِ نفس در نہادش ہمچنان متمکن۔ تا بجائیکہ نانے را بجانے از دست ندادے و گربۂ ابوہریرہ را بہ لقمہ ننواختے و سگ اصحاب کہف را اُستخوانے نینداختے۔ فی الجملہ کسے خانۂ او را ندیدے درکشادہ و سفرۂ او را سر۔ بیت

درویش بجز بوی طعامش نشمیدے	مُرغ از پس نان خوردنِ او ریزہ نچیدے

ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اِس طرح کیا ہے "سہمگین آبے کہ مرغابی دروامین نبودے" اگر غور سے دیکھئے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے۔ مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی۔

سوپر نیچرل یعنی فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جن سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہُوا ہے اِن کتابوں میں بہت کم ہیں۔ تمام گلستان اور بوستان میں صرف دو تین حکائتیں ایسی ہیں جو اِس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد اُن میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا۔

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے۔ اور اب بھی چلا جاتا ہے اگر کسی کتاب میں زمانہ حال کے فلسفۂ مسلّمہ کے برخلاف ہوں تو اُس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اکثر مشنری لوگ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اِس بحث کے متعلّق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصہ نقل کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ علمی سوسائٹی میں چند یورپین عالم اور مشنری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر ایک مضمون پڑھا گیا۔ جس میں گلستان کے فقرۂ مذکورہ کی تائید کی گئی تھی۔ ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر اِس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے اُس میں سے نکال دینا چاہئے۔ اِس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہُوا۔ آخر ہمارے دوست جو اِس قصے کے راوی ہیں اُنہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اِس بحث کا محاکمہ یُوں ہو سکتا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کے لئے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک سچ بولنے سے بہتر ہے اِس کے بعد اُنہوں نے

یہ مثال دی کہ ۱۸۵۷ء میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یورپین عورتوں اور بچّوں کو ظالموں اور بے رحموں کی شر سے بچانے کے لئے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا۔ اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بیگناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک سچ بولنے سے بہتر تھا۔ اِس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفّاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اُس نے گلستان کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لئے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

گر راست سخن گوئی و در بند بمانی	بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ صورت مفروضہ میں بھی مقتضائے جواںمردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں اُن مظلوموں پر نثار کیا جائے۔ جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے"۔ لیکن ہمارے نزدیک جبھی تک جواںمردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہوّر اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی۔ اِسی طرح شیخ کے اِس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسے	ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث

اور فضول اور بیکار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلّت بدل جاتی ہے یا نہیں علمِ اخلاق کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہُوا۔ اِنگلستان کے ایک روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سویلزیشن نے اِنسان کے اخلاق پر اِس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں مگر گناہ بدستور موجود ہیں پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے۔ اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِسی لئے رُسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلّت سے نہیں ٹلتا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ "یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہوسکتا"۔ فی الواقع اس سے کمال تعصّب پایا جاتا ہے مگر اِس پر کوئی مہذّب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کر سکتا ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے آریا نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اِس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دَور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی باایںہمہ شائستگی وتہذیب نوبلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں۔

ایک اور جگہ گلستان میں لکھا ہے کہ اگلے زمانہ میں ایک مریض بادشاہ کے لئے چند حکمائے یونان نے آدمی کا پتہ جو خاص صفات سے موصوف ہو تجویز کیا تھا۔ مگر تجربے کی نوبت نہیں آئی یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو مگر شیخ اِس اعتراض سے بری ہے اس کا الزام جو کچھ ہے مجوزین پر ہے۔ نہ

اُن کی تجویز کے راوی پر۔ شیخ پر البتہ اُس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا۔ کہ وہ اُنکی تجویز کو پسند کرتا۔ یا یہ لکھتا کہ اُس سے بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ یا جو فرض معلّمین اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصّے اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اُس سے عہدہ برآنہ ہوتا۔

بعض ملّایانہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سُنے گئے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستان میں کہا ہے ؎

"رہ راست برو اگرچہ دُور ست	زن بیوہ مکن اگرچہ حُور ست

اِس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اُس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کٹ مُلّا بیوہ کی جگہ ہیوہ[۱] بتاتے ہیں۔ جس کے معنی اُنہیں کو معلوم ہیں یہ ویساہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا "شعرِ مرا بمدرسہ کہ برد" ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاوی نہیں ہے۔ کہ جس کی ہر امر و نہی کو ہر امر و نہی مصطلحٔ فقہا پر محمول کیا جائے وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اُس کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جس کو مضر سمجھتا ہے اُس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہا نے اُس کو مباح لکھا ہو کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہٖ کیسی ہے۔ سو حدیث نبویؐ سے بھی ابکار کی ترجیح ثیبات پر ثابت ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اُس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے

[۱] ہیوہ کے معنی لُغت میں متجدّد اور متغیّر ہونیکے لکھے ہیں جو اِس شعر میں کسی طرح چسپان نہیں ہو سکتے۔

سومنات کا قصہ لکھا ہے مگر ہم نے اُس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ہیں جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں۔

امرد پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آتا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس باب میں جو کچھ ہم نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے۔ وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لئے کافی ہو۔

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اس کے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں فرق آئے اور زیادہ اُن کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ کپڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اُسی قدر جلد ذرا سے دھبّے سے میلا ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں اور آجکل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے اُسی طرح مشرقی سلسلہ تعلیم کا جزو اعظم ہیں۔ اُن کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرعے کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے مشنریوں نے صرف اس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئی ہیں۔ اور ایسے مضامین کا سلسلہ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے خلاف ہے۔ ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لئے بڑے بڑے طولانی ریویو لکھ کر چھپوائے ہیں۔ نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچّے پڑھتے ہیں۔ اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کئے گئے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانہ متوسط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا۔

دوسری عام اور بڑی خوبی جو اِن کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا انداز بیان ہے۔ جس کا ملکہ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی پابندی سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی اُستاد کی تعلیم سے آتی ہے۔ بلکہ جس طرح حسن صورت اور حسن صوت قدرتی خوبیاں ہیں اُسی طرح حسن بیان بھی ایک جبلّی خاصہ ہے جس میں اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے۔ جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اُس کے لئے وہ ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈھ لاتا ہے جو کسی کے وہم وگمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے "اَلصُّمتُ زِینَۃُ العَالِمِ وَ سِترُالجَاھِلِ یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی پردہ پوش اِس مطلب کو وہ شعر میں اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

ترا خامشی اے خداوند ہوش	وقار ست و نااہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبت خود مبر	وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یا مثلاً اُس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سُنتے وہ آخر کو پچھتاتے ہیں یا زک اُٹھاتے ہیں۔ اِس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے "ہر کہ نصیحت نشنود سر ملامت شنیدن دارد" یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شے کی قدر اُس کے کمیاب ہونے سے ہوتی ہے۔ اِس کو وہ اِس طرح لکھتا ہے "اگر شبہا ہمہ شب قدر بودے شب قدر بے قدر بودے" یا مثلاً اُس کو یُوں بیان کرنا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے۔ اِس کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے "ہر کہ با داناترے از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ دانا ست بدانند کہ نادان ست" یا مثلاً اِس مطلب کو کہ سب

پیٹ کی خاطر سختی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اِس عنوان سے بیان کرتا ہے " اگر جور شکم نبودے ہیچ مرغ در دام نیفتادے بلکہ صیّاد خود دام نہ نہادے "۔ یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیما ہو جاتا ہے اِس طرح بیان کرتا ہے " ہمہ کس را دندان بہ ترشی کند گردد مگر قاضیان را بشیرینی "۔ یا مثلاً اِس مطلب کو کہ ریا کے لئے لذّتوں کو ترک کرنا بُرا ہے۔ وہ اِس اسلوب سے ادا کرتا ہے " ہر کہ ترک شہوت از بہر قبولِ خلق دادہ است از شہوتِ حلال در شہوت حرام افتادہ است "۔ یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ وزاری سے قضائے الٰہی نہیں بدلتی اور قانونِ قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اِس کو اِس طرح ادا کرتا ہے ؎

قضا دگر نشود در ہزار نالہ و آہ	بہ شکر یا بہ شکایت بر آید از دہنے
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزائنِ باد	چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

یا اُس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائیگی۔ اِس مطلب کو وہ یُوں ادا کرتا ہے ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی	کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُسے بیان کرنا ہے ایک واقع کی صورت میں بیان کرکے اُس کو زیادہ پُرتاثیر اور دلنشین کر دیتا ہے۔ مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا۔ کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزارہا اُمیدیں اور ارمان دِل میں لئے ہوئے مر گئے اِسی طرح ایک روز ہم تم بھی مر جائیں گے۔ اِس مطلب کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

شنیدم کہ یک بار در دجلۂ	سخن گفت با عابدے کلۂ
کہ من فر فرماندہی داشتم	بسر بر کلاہ مہی داشتم
سپہرم مدد کرد و نصرت وفاق	گرفتم بباز و ئے دولت عراق

طمع کردہ بودم کہ کرماں خورم	کہ ناگاہ بخوردند کرماں سرم
بکن پنبۂ غفلت از گوش ہوش	کہ از مردگان پندت آید بگوش

اخیر کے شعر سے اُس نے یہ بات جتادی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپری نہیں بولی تھی بلکہ یہ صرف بیان کرنے کا پیرایہ ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ دکھانا منظور تھا۔ کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اِس مطلب کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

یکے جہود و مسلمان خلاف می جستند	چنانکہ خندہ گرفت از نزاعِ ایشانم
بہ طنز گفت مسلمان گر این قبالۂ من	درست نیست۔ خدایا جہود میرانم
جہود گفت بہ توریت میخورم سوگند	وگر خلاف کنم ہمچو تو مُسلمانم
گر از بسیطِ زمین عقل منعدم گردد	بخود گمان نبرد ہیچکس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جملہ میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلاویز نہیں ہو سکتا جیسا کہ اِس پیرائے نے اُس کو دلاویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا۔ کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصّے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے۔ اس مطلب کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

دو کس گرد دیدند و آشوب و جنگ	پراگندہ نعلین و پرندہ سنگ
یکے فتنہ دید از طرف بر شکست	یکے در میان آمد و سر شکست
کسے خُوشتر از خویشتن دار نیست	کہ با خوب و زشت کسش کار نیست

یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے۔ وہ ایک بڑی جوابدہی اپنے ذمّہ لیتا ہے۔ اِس مطلب کو وہ اِس

طرح ادا کرتا ہے ؎

آن شنیدی کہ صوفیے می کوفت	زیر نعلین خویش میخے چند
آستینش گرفت سرہنگے	کہ بیا نعل بر ستورم بند"

اِس میں پیرایۂ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا درجہ کی برتی ہے یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا جو ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام صرف فقیروں ہی پر نہیں بلکہ دولتمندوں پر بھی ہے۔ اِس مطلب کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے۔

"خواہندۂ مغربی در صفِ بزازانِ حلب می گفت اے خداوندان نعمت اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت رسم سوال از جہان برخاستے" یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزّت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اُس کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

"یکے قطرہ باران ز ابرے چکید	خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم	گر او ہست حقّا کہ من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید	صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بجائے رسانید کار	کہ شُد نامور لولوے شاہوار
بلندی بداں یافت کو پست شد	در نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں۔ اِسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اس کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

	زاہدے درمیانِ رندان بود گر ملولی زما ترش منشین	زان میان گفت شاہدے بلخی کہ تو ہم درمیانِ ما تلخی
کبھی وہ اپنے ہی کلام کو اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت بامزا کر دیتا ہے جیسے ؎		
	دو بیتم جگر کرد روزے کباب دریغا کہ بے ما بسے روزگار بسے تیر و دے ماہ و اردی بہشت	کہ مے گفت گویندۂ با رباب بروید گل و بشگفد نو بہار بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
یا جیسے	چو خلوت نیست خرج آہستہ تر کن اگر باراں بکوہستان نبارد	کہ میگویند ملّاحان سرودے بسالے دجلہ گردد خشک رودے
یا جیسے	ہمچنان در فکر آن بیتم کہ گفت زیر پایت گر بدانی حالِ مور	پیل بانے بر لب دریائے نیل ہمچو حال تست زیر پائے پیل
یا جیسے	چہ خوش گفت با کودک آموزگار	کہ کارے نکردیم و شد روزگار
یا جیسے	آن شنیدی کہ شاہدی بہ نہفت تا ترا قدر خویشتن باشد	با دل از دست دادۂ می گفت پیش چشمت چہ قدر من باشد

۳- اِن دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجّب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی ومعنوی اِن میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفٰی ہیں بااینہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کی کمال انشاپردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

شاعر اور منشی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اُس کے کلام میں

خواہی نخواہی بناوٹ اور تکلّف پیدا ہو جاتا ہے اور سر رشتہ حسن معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ شیخ نے صنائع لفظی اور معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے۔ کہ کہیں ساختگی اور تصنّع کا گمان نہیں ہوتا۔ مگر اِن عارضی نمائشوں، کا ایسا پابند نہیں ہے کہ اُن کے لئے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے۔ جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اس کی بھی دے دیتا ہے۔ اُس کی نثر میں مسجع اور مرصّع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ہوئے ہیں۔ جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار۔ جب تک خاص توجّہ سے نہ دیکھا جائے تمام فقرے یکساں اور ہموار معلوم ہوتے ہیں البتّہ بعض حکایتوں میں اُس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے۔ جیسے ساتویں باب کی اُنیسویں حکایت جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تونگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے۔ مگر اُس میں بھی الفاظ کو حُسن معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا۔ جس قدر اُس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حُسن انتظام پایا جاتا ہے اُس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیّت اور واقعیّت موجود ہے۔ حکایت مذکور کے چند متفرّق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں "توانگران دخل مسکینانند۔ و ذخیرہ گوشہ نشینان۔ و مقصد زائران و کہف مسافران۔ و متحمّل بارگراں۔ از بہر راحت دگراں دست بہ طعام انگہ برند کہ متعلّقان و زیر دستان بخورند۔ و فضلہ مکارم ایشان بارامل و ایتام و پیران و اقارب و جیران برسد[1] ∴ ∴ از معدہ خالی چہ قوت آید۔ و از دست تہی چہ مروّت زاید۔ و از پائے بستہ چہ سیر آید۔ و از دست گرسنہ چہ خیر د ∴ ∴

[1] یہ نشان ∴ ∴ اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیئے گئے ہیں ∴

فراغت با فاقہ نمے پیوندد۔ و جمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد۔ یکے تحریمۂ عشا بستہ و دیگرے منتظرِ عشا نشستہ۔ این بدان کے ماند۔ ✤ ✤ ✤ اشارت خواجۂ عالم بفقر طائفہ ایست کہ مردِ میدانِ رضا اند۔ و تسلیم تیرِ قضا۔ نہ اینان کہ خرقۂ ابرار پوشند و لقمۂ ادرار نوشند ✤ ✤ ✤ مشغول کفاف از دولتِ عفاف محروم ست و ملک فراغت زیرِ نگین رزقِ معلوم ✤ ✤ ✤

✤ گفت چندان مبالغہ در وصفِ ایشان بکردی۔ و سُخنہائے پریشان بگفتی کہ وہم تصوّر کند تریاقند۔ یا کلید خانہ ارزاق۔ مشتے متکبّر و مغرور۔ و معجب و نفور۔ مشتغل مال و نعمت۔ و مفتتنِ جاہ و ثروت۔ سخن نگویند الّا بسفاہت و نظر نکنند الّا بکراہت علما را بگدائی منسوب کنند۔ و فقرا را بہ سر و پائی معیوب گردانند۔ بعزتِ مالے کہ دارند و غیرت جائے کہ پندارند۔ برتر از ہمہ نشینند۔ و خود را بہتر از ہمہ شناسند۔ نہ آن در سر دارند کہ سر بکسے فرو آرند۔ بیخبر از قولِ حکما کہ گفتہ اند "ہر کہ بطاعت از دیگران کم ست و بہ نعمت بیش۔ بصورت توانگر ست و بمعنی درویش ✤ ✤ ✤ گفتم مذمتِ ایشان روا مدار کہ خداوند کرم اند۔ گفت غلط کردی کہ بندگانِ درم اند۔ چہ فایدہ کہ ابر آذر زند۔ و بر کس نمے بارند۔ و چشمۂ آفتابند و بر کس نمے تابند۔ و بر مرکبِ استطاعت سوارند۔ و نمیرانند۔ و قدمے بہر خدا نہ نہند۔ و درمے بے من و اذیٰ ندہند۔ مالے بمشقت فراہم آرند۔ و بخست نگہدارند و بحسرت بگذارند۔ چناں کہ بزرگان گفتہ اند۔ "سیم بخیل وقتے از خاک بر آید کہ بخیل بہ خاک در آید گفتمش بر بخل خداوندان نعمت وقوف نیافتہ الّا بعلتِ گدائی۔ و گرنہ ہر کہ طمع یکسو نہد کریم و بخیلش یکے نماید۔ محک داند کہ زر چیست۔ و گدا داند کہ ممسک کیست ✤ ✤ ✤ محال عقلست کہ اگر

ریگ بیابان دُر شود - چشم گدایان پُر شود ۞ ۞ ہرگز دیدۂ دست دعائے بر کتف بستہ - یا بعلّتِ بینوائی در زندان نشستہ یا پردۂ معصومے دریدہ - یا کفے از معصم بریدہ الّا بعلّتِ درویشی - شیر مردان را بحکم ضرورت در نقب ہا گرفتہ اند و کعب ہا سفتہ ۞ ۞ اغلب تہیدستان دامنِ عصمت بمعصیت الآیند و گرسنگان نان مردم ربایند - بیت

۞ چوں سگِ درندہ گوشت یافت نہ پرسد	کین شُترِ صالح ست یا خرِ دجال

۞ ۞ گفتانہ - کہ من بر حال ایشان رحمت می برم - گفتم نہ - کہ بر مالِ ایشان حسرت می خوری ۞ ۞ ہر بیذقے کہ براندے بدفع آن کوشیدمے - و ہر شامے کہ بخواندے بفرزین بپوشیدمے تا نقد کیسۂ ہمّت در باخت - و تیرِ جعبۂ حجّت ہمہ بینداخت ۞ ۞ ہر جا کہ گلست خارست و باخمر خمار - و بر سرِ گنج مار - و آنجا کہ دُرِ شاہوارست - نہنگ مردم خوار - لذّت عیش دنیارا لدغہ اجل در پیش ست - و نعیم بہشت را دیوار مکارہ در پیش ۞ ۞ نظر نہ کنی در بستان کہ بید مشک ست و چوب خشک ہمچنین در زمرۂ تونگران شاکرند و کفور - و در حلقۂ درویشان صابرند و ضجور - ۞ ۞ مقربانِ حضرتِ حق جلّ وعلا تونگرانند درویش سیرت - و درویشانند تونگر ہمّت - و مہین تونگران آنست کہ غمِ درویشان بخورد - و بہین درویشان آن کہ کم تونگران گیرد - ۞ ۞ نعم طائفہ ہستند بدین صفت کہ بیان کردی - قاصرِ ہمّت - و کافر نعمت - کہ ببرند و بنہند و نخورند و ندہند - ۞ ۞ قومے برین نمط ہستند کہ شنیدی و طائفۂ خوان نعمت نہادہ و صلاے کرم در دادہ و میان بخدمت بستہ - و ابرو بہ تواضع کشادہ طالب نامند و مغفرت - و صاحب دُنیا و آخرت -

۴۔ شیخ اکثر اِن کتابوں میں ایسی حکائیتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت بلیغ کے کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حُسن بیان سے تمام حکایت کو نہایت لطیف و ملیح کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ ایزاد کر کے اُس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تاکہ پند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دُور ہو جائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمہ میں اُسنے لکھا ہے۔

غالب گفتار سعدی طرب انگیز ست و طیبت آمیز۔ و کوتہ نظران را بدیں علت زبانِ طعنہ دراز کہ "مغز دماغ بیہودہ بُردن و دودِ چراغ بے فائدہ خوردن کار خرد مندان نیست" ولیکن بر رائے روشنِ صاحبدلاں کہ روی سخن در ویشانست پوشیدہ نماند کہ دُرِ موعظہائے صافی در سلکِ عبارت کشیدہ ست و داروی تلخ نصیحت بشہد ظرافت آمیختہ۔ تا طبع ملول انسان از دولت قبول محروم نماند" جو ظرافت اُس نے بوستان اور گلستان میں برتی ہے وہ اکثر نہایت سنجیدہ اور معقول ہے البتہ کہیں کہیں اُس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانونِ شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں۔ لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اُسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رُک نہیں سکتی ؎

نکو رو تاب مستوری ندارد		چو در بندی سر از روزن بر آرد	

اس قسم کی چند حکائتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں۔

مثال ۱۔ مہمانِ پیرے بودم در دیار بکر کہ مالِ فراوان داشت و فرزندے خوبرو۔ شبے حکایت کرد کہ "مرا در ہمہ عمر جز این فرزند نبودہ است درختے درین وادی زیارت گاہ است کہ مردمان بحاجت خواستن آنجا روند۔ شبہائے دراز در پائے آن درخت بحق نالیدہ ام تا مرا این فرزند بخشیدہ" شنیدم کہ پسر با رفیقان ہمی گفت "چہ بودے اگر من آن درخت را بدانستمے کہ کجاست تا دعا کردمے کہ پدرم زودتر بمیرد" خواجہ شادی کنان کہ پسرم عاقل ست و پسر طعنہ زن کہ پدرم فرتوت لایعقل۔ قطعہ

سالہا بر تو بگذرد کہ گذر تو بجائے پدر چہ کردی خیر	نہ کنی سوئے تربتِ پدرت تا ہمان چشم داری از پسرت

مثال ۲۔ پیرمردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ و حجرہ بگل آراستہ و بخلوت با او نشستہ و دیدہ و دل در و بستہ۔ شبہائے دراز نخفتے و بذلہا و لطیفہا گفتے باشد کہ موانست پذیرد و وحشت نگیرد۔ بالجملہ شبے میگفت "بخت بلندت یار بود و چشم دولتت کہ بیدار کہ بہ صحبت پیرے افتادی پختہ۔ پروردہ۔ جہاندیدہ۔ آرمیدہ نیک و بد جہان آزمودہ سرد و گرم روزگار چشیدہ۔ کہ حق صحبت بداند و شرط مودت بجا آرد۔ مشفق و مہربان۔ خوش طبع و شیرین زبان مثنوی

تا توانم دلت بدست آرم در چو طوطی شکر بود خورشت	در بیازاریم نیازارم جان شیرین فدای پرورشت

نہ گرفتار آمدی بدست جوانے متعجب۔ خیرہ رائے۔ سر تیز۔ سبک پائے۔ کہ ہردم ہوسے پزد۔ و ہر شب جائے خسپد۔ و ہر روز یارے گیرد۔ قطعہ

جوانان خرّم اند و خوب رخسار / ولیکن در وفا با کس نپایند
وفاداری مدار از بُلبلان چشم / که هر دم بر گلے دیگر سرایند

برخلاف پیران که به عقل و ادب زندگانی کنند۔ نه بمقتضاے جهل و جوانی۔ بیت

زخود بهترے جوی و فرصت شمار / که با چون خودی گم کنی روزگار

گفت چندان که برین نمط بگفتم گمان بردم که دلش در قید من آمد و صید من شد۔ ناگاه نفسے سرد از دل پُر درد برآورد و گفت۔ که چندین سخن که گفتی در ترازوئے عقلِ من وزن آن یک سخن ندارد که وقتے شنیده ام از قابلهٔ خویش که گفتُ زن جوان را اگر تیرے در پهلو نشیند به که پیرے۔" فی الجمله امکانِ موافقت نبود بمفارقت انجامید۔ چون مُدتِ عدّتش بسر آمد عقدِ نکاحش ببستند با جوانے تُند۔ تُرش روے۔ تهیدست۔ بدخُوے۔ جور و جفا میدید۔ و رنج و عناے کشید و شکر نعمت حق همچنان میگفت که الحمدلله ازاں عذابِ الیم برهیدم و بدین نعمتِ مقیم رسیدم۔

قطعه

مثال۳

با تو مرا سوختن اندر عذاب / به که شدن با دگرے در بهشت
بوے پیاز از دهن خوبروی / خوب تر آید که گل از دست زشت
مرا حاجیے شانهٔ عاج داد / که رحمت بر اخلاقِ حجّاج باد
شنیدم که بارے سگم خوانده بود / که از من بنوعے دلش مانده بود
بینداختم شانه کین استخوان / نمی بایدم دیگرم سگ مخوان
مپندار چون سرکهٔ خود خورم / که جورِ خداوند حلوا برم
قناعت کن اے نفس بر اندکے / که سلطان و درویش بینی یکے

چرا پیش خسرو بحاجت روی | چو یکسو نہادی طمع خسروی

یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرعے ہیں رحمت کا لفظ کنایتہً بجائے نفرین اور اُس کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی۔ قساوت اور تکبّر وغیرہ صفات ذمیمہ مسلم ہیں۔ چنانچہ گلستان میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے:" ؎

از من بگوے حاجی مردم گزای را	کو پوستین خلق بہ آزار میدرد
حاجی تو نیستی شُتر ست از برائے آنکہ	بیچارہ خار میخورد و بار مے برد"

ایک اور شاعر کہتا ہے:" ؎

چوں عالمے کہ دل زور بیجانہ جمع کرد	حاجی ستم بخلق خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اِس کنائے میں ہے۔ وہ صراحت میں ہر گز ممکن نہ تھی۔ اکثر ناواقف لوگ اِس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے۔ حقیقی معنی سے آبا کرتا ہے۔

مثال ۴۔ بازرگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شُتر بار داشت و چہل بندۂ خدمتگار شبے در جزیرۂ کیش مرا بحجرۂ خویش برد۔ و ہمہ شب نیارمید از سخنہاے پریشان گفتن کہ" فلاں انبارم بترکستان است۔ و فلان بضاعت بہندوستان۔ و این قبالۂ فلان زمین ست و فلان مال را فلان کس ضمین" گاہ گفتے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوائش خوش ست۔ و باز گفتے نہ کہ دریائے مغرب مشوش ست۔ سعدیا سفرے دیگر درپیش ست۔ اگر آن کردہ شود بقیّت عمر بگوشہ بنشینم۔ گفتم آن کدام سفرست۔

گفت "گوگرد پارسی به چین خواهم بردن که شنیدم که قیمت عظیم دارد- واز انجا کاسهٔ چینی بروم برم- و دیباے رومی بهند- و پولاد هندی بحلب- و آبگینهٔ حلبی به یمن- و بردِ یمانی بپارس- ازان پس ترکِ سفر کنم و بدکانے نشینم" چندانے ازین مالیخولیا فروگفت که بیش طاقتِ گفتنش نماند- گفت سعدی تو هم سخنے بگو از آنها که دیدی و شنیدی- گفتم- نظم

	آن شنیدستی که وقتے تاجرے	در بیابانے بیفتاد از ستور
	گفت چشمِ تنگ دُنیا دار را	یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

مثال ۵	ملک صالح از بادشاهان شام	برون آمدے صبحدم با غلام
	بگشتے در اطرافِ بازار و کوی	برسمِ عرب نیمه بربسته روی
	که صاحب نظر بود و درویش دوست	هر آن کین دو دارد ملک صالح اوست
	دو درویش در مسجدے خُفته یافت	پریشان دل و خاطر آشفته یافت
	شب سرد شان دیده نابرده خواب	چو حربا تامّل کنان ز آفتاب
	یکے زان دو میگفت با دیگرے	که در روزِ محشر بود داورے
	گر این بادشاهانِ گردن فراز	که در لهو و عیش اند و با کام و ناز
	در آیند با عاجزان در بهشت	من از گور سر برنگیرم ز خشت
	بهشتِ برین ملکُ و ماوای ماست	که بندِ غم امروز بر پاے ماست
	همه عمر ازینان چه دیدی خوشی	که در آخرت نیز زحمت کشی
	اگر صالح آنجا بدیوارِ باغ	در آید بکفشش بدرم دماغ
	چو مرد این سخن گفت و صالح شنید	دگر بودن آنجا مصالح ندید

دمے رفت تا چشمۂ آفتاب — زچشم خلائق فروشست خواب
روان ہر دو کس را فرستاده خواند — بہ ہیبت نشست و بحرمت نشاند
برایشان بہبارید بارانِ جود — فروشست شان گرد دل از وجود
پس از رنج سرما و باران و سیل — نشستند با نامدارانِ خیل
گدایانِ بے جامہ شب کرده روز — معطر کنان جامہ بر عود سوز
یکے گفت ازاینان ملک را نہان — کہ اے حلقہ در گوشِ حکمت جہان
پسندیدگان در بزرگی رسند — زما بندگانت چہ آمد پسند
شہنشہ زشادی چو گل بر شگفت — بخندید و در روے درویش وگفت
من آنکس نیم کز غرور حشم — زبیچارگان روے درہم کشم
توہم با من از سر بنہ خوی زشت — کہ ناسازگاری کنی در بہشت
من امروز کردم در صلح باز — تو فردا مکن در برویم فراز
چنین راه گر مقبلی پیش گیر — شرف بایدت دست درویش گیر
براز شاخ طوبے کسے برنداشت — کہ امروز تخم ارادت نہ کاشت
ارادت نداری سعادت مجوی — بچوگانِ خدمت توان برد گوئی
ترا کے بود چوں چراغ التہاب — کہ از خود پُری ہمچو قندیل زاب
وجودے دہد روشنائی بجمع — کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

۵- وه اکثر نہایت پاکیزه اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے۔ جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

مثال ۱ - ہر نفسے کہ فرو میرود ممدّ حیات ست وچون بر می آید مفرّح ذات - پس در ہر نفسے دو نعمت موجود ست و بہر نعمتے شکرے واجب - یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونو سانس کی انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں سب کو معلوم تھی - اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے - مگر یہ نکتہ مخفی تھا - کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے ؎

مثال ۲	چو طفل اندروں دار واز حرص پاک	چہ مشت زرش پیش وچہ مشت خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچّہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا - کہ اُس کو سونے اور مٹّی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی - مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹّی کو برابر جاننا جو کہ اعلےٰ درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے بچّہ کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے - کیونکہ سونے اور مٹّی میں کچھ فرق نہ کرنا جبھی تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں ہوتی - پس ایک شاعر نہ کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے - کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں ؎

مثال ۳	ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم ازاں مار بر پائے راعی زند	وگر با چو او صد برائی بجنگ کہ ترسد سرش را بکوبد بسنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زبردست بھی زیر دستوں پر غالب آجاتے ہیں - اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے - مگر یہ نکتہ مخفی تھا - کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں -

مثال ۴	وہ کہ گر مردہ باز گر دیدے ردّ میراث سخت تر بودے		بمیانِ قبیلہ و پیوند وارثاں را زمرگِ خویشاوند"

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا۔ کہ مرگِ خویشاوند سخت مُصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مُردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اُس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا۔

اسی طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگذشتوں سے ایسے نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم وگمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچّہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لئے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اُس سے لی جاسکتی ہے۔ پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کردیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے۔ یا مثلاً مَیں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عیدگاہ میں گیا۔ اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے بچھڑ گیا مَیں اُسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آکر دفعتہً میرا کان مروڑا اور فرمایا "مَیں نے تجھ کو بارہا کہا ہے کہ میرا دامن پکڑے رہا کر مگر تُو نہیں مانتا"۔ سچ ہے جس طرح انجان بچّہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اِس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لینا روا نہیں ہے یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اینٹھ کر کہا کہ "نالائق! میں نے تُجھ کو کلہاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی"۔ اسی

طرح زبان ذکر اور شکر کے لئے بنی ہے۔ لوگوں کی غیبت کرنے کے لئے نہیں بنی۔ یا ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا۔ دوسرے نے اُس کو جھڑک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا، میرا دل یہ بات سُن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جاسکیں گے۔

۶۔ حسنِ تاویل اور لطفِ استدلال جیسا چچا تُلا اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے ایسا اور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا ؏

مثال۱	شنیدم کہ در روزگارِ قدیم	شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
	نہ پنداری این قول معقول نیست	چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانہ میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے۔ اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں اُن کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر خارق عادت کو کس حُسن بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے ؏

مثال۲	رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست	بر عارفان جز خدا ہیچ نیست
	توان گفتن این با حقائق شناس	و لے خوردہ گیرند اہل قیاس
	کہ پس آسمان و زمین چیستند	بنی آدم و دام و دد کیستند
	پسندیدہ پُرسیدی اے ہوشمند	بگویم گر آید جوابت پسند
	کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک	پری آدمی زاد و دیو و ملک
	ہمہ ہرچہ ہستند زان کمترند	کہ با ہستیش نام ہستی برند
	عظیم ست پیشِ تو دریا بہ موج	بلندست گردونِ گردان بہ اوج

ولے اہل صورت کجا پے برند	کہ ارباب معنی بملکے درند
کہ گر آفتاب است یک ذرہ نیست	وگر ہفت دریاست یکقطرہ نیست
چو سلطانِ عزّت علم بر کشد	جہان سر بجیب عدم در کشد

یہاں اُس نے وحدتِ وجود کے اصلی معنی جو کہ اہل نظر کی سمجھ سے بالاتر تھے نہیں بتائے بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان کئے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا ہے

مثال ۳

نگہدار فرصت کہ عالم دمی ست	دمے پیشِ دانا بہ از عالمے ست
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت	دران دم کہ بگذشت و عالم گذاشت
میسّر نبودش کزو عالمے	ستانند و فرصت دہندش دمے

یہاں اُس نے دو متضاد دعوے کئے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہا تو معلوم ہُوا کہ اُسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض میں نہ مل سکا تو معلوم ہُوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا۔ یہ غایت درجے کا حسن استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کئے جائیں اور حسن شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

۷۔ نیچر کے کلام میں شیخ کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں

کہ اُن کو ویسے پاکیزہ اور دلنشین بیان کے ساتھ ادا کر سکے۔ اُس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ شعر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا	میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مثال اگر از حق نہ توفیق خیرے رسد
کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد

زبان را چہ بینی کہ اقرار داد
بہ بین تا زبان را کہ گفتار داد

در معرفت دیدۂ آدمی ست
کہ بکشادہ بر آسمان و زمی ست

کیت فہم بودے نشیب و فراز
گر این در نکردے بروے تو باز

سر آورد و دست از عدم در وجود
درین جود بنہاد و در وے سجود

وگرنہ کے از دست جود آمدے
محالست کز سر سجود آمدے

بحکمت زبان داد و گوش آفرید
کہ باشند صندوق دل را کلید

اگر نہ زبان قصہ بر داشتے
کس از سرِ دل کے خبر داشتے

وگر نیستے سعی جاسوسِ گوش
خبر کے رسیدے بسلطانِ ہوش

مرا لفظ شیرین خوانندہ داد
ترا سمع درّاک دانندہ داد

مدام این دو چون حاجبان بردرند
ز سلطان بہ سلطان خبر می برند

چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست
ازان در نگہ کن کہ تقدیر اوست

برد بوستان بان بہ ایوانِ شاہ
بہ تحفہ ثمر ہم ز ایوانِ شاہ

اِس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدوں خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور زبان۔ کان۔ آنکھ۔ سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ اغراض بیان کئے ہیں۔ یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم

ہوتی ہیں۔ مگر جس ترتیب سے شیخ نے اِن کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہی باغ میں سے بادشاہ کے لئے لگا کر لے جاتا ہے۔ تمثیل دے کر مضمون کو حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے ٥

مثال ۲	دو صد مہرہ در یکدگر ساختست	کہ گل مہرۂ چوں تو پرداختست
	رگت در تنست اے پسندیدہ خوے	زمینے در و سیصد و شصت جوے
	بصر در سر و فکر و رائے و تمیز	جوارح بدل و دل بدانش عزیز
	بہائم برو اندر افتادہ خوار	تو ہمچون الف بر قدمہا سوار
	نگون کردہ ایشان سر از بہر خور	تو آری بعزت خورش پیش سر
	نہ زیبد ترا با چنین سروری	کہ سر جز بطاعت فرود آوری

مثال ۳	شب از بہر آسائش تست و روز	مہ روشن و مہر گیتی فروز
	صبا از برائے تو فراش دار	ہمے گسترانند بساطِ بہار
	اگر باد و برفست و باران و میغ	وگر رعد چوگان زند برق تیغ
	ہمہ کار دارانِ فرمان برند	کہ تخم تو در خاک مے پرورند
	وگر تشنہ مانی ز سختی مجوش	کہ سقّائے ابر آبت آرد بدوش
	ز خاک آورد رنگ و بوے و طعام	تماشا گو دیدۂ و مغز و کام
	عسل دادت از نحل و من از ہوا	رطب دادت از نخل و نخل از نوا
	ہمہ نخلبندان بخایند دست	ز حیرت کہ نخلے چنین کس نہ بست
	خور و ماہ و پروین برائے تو اند	قنادیل سقفِ سرائے تو اند

زخارت گل آورد واز نافہ مشک	زر از کان و برگِ تر از چوب خشک
بدستِ خودت چشم وابرو نگاشت	کہ محرم بہ اغیار نتوان گذاشت
توانا کہ آن نازنین پرورد	بالوانِ نعمت چنین پرورد
بجان گفت باید نفس بر نفس	کہ شکرش نہ کار زبان ست وبس

۸- وہ اکثر قانونِ قدرت سے اشیا کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دلنشین اور عام فہم ہوتا ہے۔ کلام الٰہی میں بھی مبداء و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے ۵

مثال ۱	پلیدی کند گربہ برجاے پاک	چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک
	تو آزادی از ناپسندیدہا	نترسی کہ بر روے فتد دیدہا

بلی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اُس کو فوراً مٹی سے ڈھانک دیتی ہے۔ اِس سے وہ اِس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بُرے اعمال کو ہمیشہ لوگوں سے چھپانا چاہئے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کے برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

مثال ۲- حلم شُتر چنانکہ معلوم ست اگر طفلے مہارش گیرد وصد فرسنگ ببرد گردن از متابعت او نہ پیچد- اما اگر راہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواہد رفتن زمام از کفش درگسلاند- وبیش متابعت نکند کہ ہنگام درشتی ملاطفت مذموم ست- قطعہ

کسیکہ لطف کند با تو خاک پایش باش	وگر ستیزہ کند در دو چشمش افگن خاک

سخن بلطف وکرم با درشت خوی مگوی	کہ زنگ خوردہ نگردد مگر بسوہن پاک

یہاں اُس کو یہ سوجھانا منظور تھا۔ کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے۔ جہاں تک دوسری طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچّہ اُس کی نکیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے۔ وہاں اُس کی اطاعت نہیں کرتا اور رسّی توڑا کر بھاگ جاتا ہے ؏

مثال [۳]

برہ بریکے پیشم آمد جوان	بہ تگ در پیش گوسفندے دوان
بدو گفتم این ریسمانست وبند	کہ مے آرد اندر پیت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد	چپ وراست پوئیدن آغاز کرد
برہ در پیش ہمچنان میدوید	کہ جو خوردہ بود از کفِ مرد خید
چو باز آمد از عیش و بازی بجاے	مرا دید گفت اے خداوند راے
نہ این ریسمان میبرد بامنش	کہ احسان کمندیست در گردنش
بہ لطفے کہ دیدست پیل دمان	نیارد ہمے حملہ بر پیلبان
بداں را نوازش کن اے نیک مرد	کہ سگ پاس دارد چو نانِ تو خورد
بران مرد کُندست دندانِ یوز	کہ مالد زبان بر پنیرش دو روز

یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کروگے اُسی قدر لوگ تمہارے دوست اور خیر خواہ و جان نثار ہونگے۔ اِس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری۔ ہاتھی۔ کُتّا۔ چیتا۔ اور اِسی طرح تمام حیوانات کو قُدرت نے

یہ بات سکھائی ہے - کہ جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اُسی کا دم بھرنے لگتے ہیں - یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبعیّت باقی نہیں رہتی -

۹ - وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزا اور سامعین کے دل پر گراں ہوتی ہیں نہیں بلکہ اکثر آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے - جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں - لیکن حدّ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اِس لئے اُن کو زاہد اور رند دونوں پسند کرتے ہیں ؎

مثال۱	بسرہنگ سلطان چنین گفت زن برو تا ز خوانت نصیبے دہند بگفتا بود مطبخ امروز سرد زن از نا اُمیدی سر انداخت پیش کہ سلطان ازین روزہ گوئی چہ خواست خورندہ کہ خیرش برآید ز دست مسلّم کسے را بود روزہ داشت وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری	کہ خیر اے مبارک در رزق زن کہ فرزندگانت بہ سختی درند کہ سلطان بشب نیت روزہ کرد ہمے گفت باخود دل از فاقہ ریش کہ افطار او عید طفلانِ ماست بہ از صائم الدہر دنیا پرست کہ درماندہ را دہد نانِ چاشت ز خود باز گیری و ہم خود خوری	
مثال۲	شنیدم کہ مردے بماہ حجاز چنان گرم رو در طریق خداے بآخر ز وسواسِ خاطر پریش بہ تلبیس ابلیس در چاہ رفت	بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز کہ خار مغیلان نہ کندے ز پاے پسند آمدش در نظر کار خویش کہ نتوان ازین خوبتر راہ رفت	

گرش رحمتِ حق نہ دریافتے	غرورش سراز جادہ برتافتے
یکے ہاتف از غیب آواز داد	کہ اے نیک بخت مبارک نہاد
مپندار گر طاعتے کردۂ	کہ نزلے درین حضرت آوردۂ
بہ احسانے آسودہ کردن دلے	بہ از الف رکعت بہر منزلے

۱۰۔ جب اُس کو کسی خاص فرقہ یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ اُمرا اور دولتمندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اُس نے اِس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں امرا کا طرف دار اور اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمائتی قرار دیا ہے۔ لِکھ کر تمام دِل کے خیالات ظاہر کئے ہیں طرفِ ثانی امیروں کی بُرائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اُس کی تقریر کو رد کرکے امرا کی خوبیاں اور درویشوں کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اِسی طرح اُس نے تمام سلاطین عہد اور وزرا اور اُمرا کی خاطرخواہ خبر لی ہے۔ چنانچہ گلستان کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے۔ یا مثلاً اُس کو مشائخ و زہاد کی قلعی کھولنی منظور تھی اِس مضمون کو اُس نے کھلّم کھلّا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قِصّہ جو بوستان کے چوتھے باب میں مذکور ہے نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُسوقت کچھ نہ تھا اِس لئے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقرا اور تمام مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے۔ جتنے واقعی عیب اکثر اِن لوگوں میں ہوتے ہیں

سب ظاہر کر دیئے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اِس مقولے پر ختم کرتے ہیں ؎

نخواہم درین باب ازین بیش گفت	کہ شنعت بود سیرت خویش گفت

یعنی مَیں اِس باب میں اِس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی "وہ اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے"۔ کیونکہ آپ بھی اُسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور تحمّل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا ٭

۱۱۔ یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کئے جاتے ہیں۔ وہ اتنے موثر نہیں ہوتے جتنا کہ اپنی سرگذشت اور روداد کا بیان موثر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سُنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سُنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگذشت کو بہ نسبت اخبار ماضیہ کے زیادہ پُر جوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستان اور بوستان میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور اُن سے نتائج استخراج کئے ہیں۔ اِس لئے اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اِس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان اُن کو بیان کرتا ہے۔ ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

مثال ۱	بہ صنعا درم طفلے اندر گذشت	چہ گویم کزانم چہ بر سر گذشت
	قضا نقشِ یوسف جمالے نکرد	کہ ماہئ گورش چو یونس نخورد

درین باغ سروے نیامد بلند — که باد اجل بیخش از بن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت — که چندین گل اندام در خاک خفت
بدل گفتم اے ننگ مردان بمیر — که کودک رود پاک و آلوده پیر
ز سودائے آشفتگی بر قدش — برانداختم سنگے از مرقدش
زہولم دران جائے تاریک و تنگ — بشورید حال و بگردید رنگ
چو باز آمدم زان تغیر بہوش — ز فرزند دلبندم آمد بگوش
گرت وحشت آمد ز تاریک جائے — بہش باش و با روشنائی درائے
شب گور خواہی منور چو روز — ازینجا چراغ عمل بر فروز
تن کارکن مے بلرزد ز تپ — مبادا کہ نخلش نیارد رطب
گروہے فراوان طمع ظن برند — کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند
برآن خورد سعدی کہ بیخے نشاند — کسے برد خرمن کہ تخمے فشاند

۱۲۔ جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گذرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد دلاتا ہے۔ جو اُس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گذرتی ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اُس کو متنبہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صاف اور صریح نتیجے سوجھاتا ہے جو دُنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھُولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھچتے ہیں۔ اور اُس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے

آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے ؂

مثال ۱	پدر مُردہ را سایہ بر سر فگن	غبارش بیفشان و خارش بکن
	چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش	مدہ بوسہ بر روئی فرزندِ خویش
	یتیم ار بگرید کہ نازش خرد	وگر خشم گیرد کہ بارش برد
	الا تا نگرید کہ عرشِ عظیم	بلرزد ہمے چون بگرید یتیم
	برحمت بکن آبش از دیدہ پاک	بہ شفقت بیفشانش از چہرہ خاک
	اگر سایۂ او برفت از سرش	تو در سایۂ خویشتن پرورش
	من آنگہ سرِ تاجور داشتم	کہ سر در کنارِ پدر داشتم
	اگر بر وجودم نشستی مگس	پریشان شدے خاطر چند کس
	کنون گر بزندان برندم اسیر	نباشد کس از دوستانم نصیر
	مرا باشد از دردِ طفلان خبر	کہ در طفلی از سر برفتم پدر
مثال ۲	پسر چون زدہ برگذشتش سنین	زنا محرمان گو فراتر نشین
	بر پنبہ آتش نشاید فروخت	کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت
	چو خواہی کہ نامت بماند بجائے	پسر را خردمندی آموز و رائے
	کہ گر عقل و رائش نباشد بسے	بمیری و از تو نماند کسے
	بسا روزگارا کہ سختی برد	پسر چون پدر نازکش پرورد
	خردمند و پرہیزگارش برار	گرش دوست داری بنازش مدار
	بخردی درش زجر و تعلیم کن	بہ نیک و بدش وعدہ و بیم کن
	نوآموز را ذکر تحسین و زہ	ز توبیخ و تہدید اُستاد بہ

بیاموز پرورده را دست رنج | وگر دست داری چو قارون بہ گنج
مکن تکیہ بر دستگاہے کہ ہست | کہ باشد کہ نعمت نماند بدست
بپایان رسد کیسۂ سیم و زر | نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور
چہ دانی کہ گر دیدنِ روزگار | بغربت بگرداندش در دیار
چو بر پیشۂ باشدش دسترس | کجا دستِ حاجت برد پیش کس
ندانی کہ سعدی مکان از چہ یافت | نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت
بہ خردی بخورد از بزرگان قفا | خدا دادش اندر بزرگی صفا
ہر آن طفل کو جور آموزگار | نہ بیند۔ جفا بیند از روزگار
پسر را نکو دار و راحت رسان | کہ چشمش نماند بدستِ کسان
ہر آنکس کہ فرزند را غم نخورد | دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد
نگہدار ز آمرزگارِ بدش | کہ بدبخت و بے رہ کند چوں خودش
پسر کو میانِ قلندر نشست | پدر گو ز خیرش فرو شوی دست
دریغش مخور بر ہلاک و تلف | کہ پیش از پدر مُردہ بہ ناخلف

یہ خصوصیتیں جو گلستان اور بوستان میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں۔ جو اِن کتابوں کی مزید شُہرت اور قبولیّت کا باعث ہوئی ہیں۔ مگر ہم انہیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں:

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زمانناً فارسی اور اُردو دیوانوں میں مروّج ہے اس طریقے پر غالباً سب سے اوّل شیخ ہی کا دیوان مدّون کیا گیا ہے کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعۂ قصائد کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

علی بن احمد بے ستون جامع کلیاتِ شیخ نے اوّل ہر غزل کے مطلع کا حرف لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروفِ تہجّی جمع کئے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی۔ کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اُس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی وفات کے بیالیس برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کئے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی۔

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طیّبات ہے۔ باقی تین دیوان اِس سے چھوٹے ہیں اگرچہ اِن میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سن کہولت اور پیری کے زمانے کے ہیں۔ مگر شیخ کا اندازِ بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبارِ صفائی اور سلامت کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدّت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوانِ شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا۔ جیسا سن کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اِس سے مستثنیٰ ہے۔ البتہ طیّبات اور بدائع جو جوانی اور

کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں اُن میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے۔

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدانِ شعرا لکھا ہے اگرچہ اس سے پہلے انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متأخرین کے اکثر تشبیبوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدے اور مثنوی پر تھا۔ بعضے دو بیتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے۔

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو اُنگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے۔ اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے۔ مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں۔ جو بدون ذوقِ سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں۔ پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نمکدانِ شعرا ہے یا وہ غزل کا پیمبر ہے اُنہیں کے لئے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا مذاق رکھتے ہیں اُن کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح ما بہ الامتیاز شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے۔ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے۔ لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

مَیں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اِس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے صاف صاف معلوم ہو۔ مُجھ کو چند

باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قُدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے غزل کو نہایت بامزا اور لُطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے۔

ا۔ شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دِلکش کر دیتا ہے۔ وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی اِسی لئے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے ۴۲ برس بعد اس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی۔ جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی ؎

نظر خدای بینان ز سر ہوا نباشد　　سفر نیاز مندان ز رہ خطا نباشد

مجلس کے خاص و عام جا بجا بے ہوش اور از خود فراموش پڑے تھے۔ اور مجلس کے برخاست ہونے کے بعد سب کا اِس بات پر اتّفاق تھا۔ کہ مدّت عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔ مَیں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے پرہیز کرتے تھے شیخ کے ایک مطلع پر جو قوّال نے بے مزا میر کے اُن کے سامنے گایا تھا۔ دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کانپنے لگا تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے۔ اور یہ کیفیت اُن پہ بہت دیر تک طاری رہی تھی وہ مطلع یہ تھا ؎

اے کہ آگاہ نۂ عالم درویشان را　　تو چہ دانی کہ چہ سودا بسرست ایشان را

۲۔ شیخ کی غزل کو اُس جبلّی عشق و محبّت نے جو اُس کی بات بات سے ٹپکتی ہے

اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشق مزاج ہوئے ہیں۔ ان کی تشبیب اور تغزل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں "آنکہ نشنید ست ہرگز بوئے عشق۔ گو بشیراز آ و خاک ما ببوی" یہی سبب ہے کہ وہ حُسن و عشق وصل و جدائی۔ یاس و اُمید۔ صبر و مجبوری۔ وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل تصنّع نہیں پایا جاتا اور وہ سب ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ جو اُس عالم میں ہر شخص پر گذرتی ہیں۔ اسی واسطے عشاق کے دِل پر اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

مقدار یار ہمنفس چوں من نداند ہیچکس ۔۔ ماہی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را
ایکہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست ۔۔ گر اُمید وصل باشد آن چنان دشوار نیست
ہر کو ہمہ عمرش سودائے گلے بودہ است ۔۔ داند کہ چرا بُلبل دیوانہ ہمے باشد
دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست ۔۔ تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی
دیگران چوں بروند از نظر از دل بروند ۔۔ تو چنان در دلِ من رفتہ کہ جان در بدنے
گفتہ بودم کہ رخت بر بندم ۔۔ تا رہِ بصرہ گیرم و بغداد
دست از دامنم نمے دارد ۔۔ خاکِ شیراز و آبِ رُکنا باد
ہزار جہد بکردم کہ سرِ عشق بپوشم ۔۔ نبود بر سر آتش میسّرم کہ بجوشم
بہ زخم خوردہ حکایت کنم ز دستِ جراحت ۔۔ کہ تندرست ملامت کند چو من بخروشم
نفحات صبح دانی زچہ روی دوست دارم ۔۔ کہ بروی دوست ماند کہ برافگند نقابے

بروای گدای مسکین درِ دیگر طلب کن
که ہزار بار گفتی و نیامدت جوابے

شربتے تلخ تر از دردِ فراقت باید
تا کند لذّتِ وصلِ تو فراموش مرا

بر عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را
از ذوقِ اندرونش پرواے در نباشد

برقِ یمانی بجست بادِ بہاری بخاست
طاقت مجنون نماند خیمۂ لیلیٰ کجاست

۳- اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے- اور وہاں جو حالت اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیّت اُس کے دِل پر گذری ہے اُس کو بیان کر رہا ہے -اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں اُسی طرح کی کیفیّت پیش آتی ہے نہایت مزا دیتے ہیں مثلاً ؎

ای روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزاے خویش

ساربان آہستہ ران کآرامِ جان در محمل ست
اشتران را بار بر پشت ست مارا بر دل ست

چہ رویست اینکه پیش کاروان ست
مگر شمعے بدستِ ساربان ست

سلیمان ست گوئی در عماری
که بر بادِ صبا تختش روان ست

زِ روی کارِ من برقع برانداخت
بیک بار آنکه در برقع نہان ست

شُتر پیشی گرفت از من برفتار
که بر من بیش از آن بارِ گران ست

بدار اے ساربان محمل زمانے
که عہدِ وصل را آخر زمان ست

یار بار افتادہ را در کاروان بگذاشتند
بیوفا یاران که بر بستند بار خویش را

ہر کرا در خاکِ غربت پاے در گل ماند ماند
گو دگر در خواب خوش بیند دیار خویش را

پیوند روح میکند این باد مشک بیز
ہنگامِ نوبتِ سحر ست ای ندیم خیز

شاہد بخوان و شمع بسوزان و گل بنہ
عنبر بسای و عود بسوزان و گل بریز

خادمہ سرائے را گو در حجرہ بند کن ‌ ‌ ‌ تا بہ سرِ حضور مارہ نبرد موسوی

۴۔ وہ اکثر حالات و واردات کو جو اُس کے دل پر گذرتے ہیں تمثیلات میں بیان کرکے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کردیتا ہے۔ اِس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ؎

بگنج شائگان افتادہ بودم	ندانستم کہ در گنج اندر ماران
اے برادر ما بگرداب اندریم	وانکہ شنعت میزند بر ساحل ست
رطب شیرین دست از نخل کوتاہ	زلال اندر میان و تشنہ محروم
اُستاد کیمیا را بسیار زر بباید	در خاک تیرہ کردن تا آنکہ زر بباشد

۵۔ شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چلبلاپن پایا جاتا ہے۔ جس سے قدما کی غزل معرّا معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرائے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گرانبہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً ؎

بود ہمیشہ پیش ازین رسم تو بیگنہ کشتی	از چہ مرا نمی کشی من چہ گناہ کردہ ام
خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من	وین عجب کان وقت میگریم کہ کس بیدار نیست
من ندانستم از اوّل کہ تو بیمہر و وفائی	عہد نابستن ازان بہ کہ ببندی و نپائی
دوستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم	باید اوّل بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی
گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم	چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی
من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم	شراب با تو حلال ست و آب بیتو حرام

اس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قُدما کی غزل کو ہے اُس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قُدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر دو شعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کئے جاتے ہیں۔

انوری	سعدی
روی چون ماہِ آسمان داری قد چون سرو بوستان داری	سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار نیست ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست
ایضاً	ایضاً
ہمہ با من جفا کند لیکن بجفا ہیچ از و نیازارم	قادری بر ہر چہ میخواہی بجز آزار من زانکہ گر شمشیر بر فرقم زنی آزار نیست
خاقانی	ایضاً
برخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری برہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری	ہمہ چشمیم تا برون آئی ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی
ایضاً	ایضاً
شاد باش اے حسن خود کرد وصفِ تو سحر حلال طبع خاقانی بہ نظم آورد و دیوان تازہ کرد	ہر دم از شاخ زبانم میوۂ تر میرسد بوستانہا رستہ زان تخمیکہ در دل کاشتی

۶۔ سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دیوان کو نمکدان شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے تصوف اور درویشی، عشق حقیقی کو عشق مجازی کے

پیرائے میں ادا کرنا اور شاہد مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دندان وغیرہ سے تعبیر کرنا کاملین اور عرفا اور مشائخ پر رند- بادہ خوار میفروش پیر خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا- سلوک اور فقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکّل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا- محتسب و زاہد و فقیہہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رو سے محلّ ادب ہیں طعن و تعریض کرنی اور غیر متشرّع اور آزاد لوگ جو از روے مذہب قابل توہین و مذمّت ہیں اُن کی خوبی ظاہر کرنی- دُنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا- ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رُسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی- عقل و دانش کی جا بجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اُس کی تعریف کرنی- ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمے کا اس لئے طلبگار ہونا کہ دُنیا کے تعلّقات سے انقطاع میسّر آئے- باد صبا اور نسیم سحری اور بُوئے گُل کو اکثر مخاطب کرنا اور اُن کو قاصد و پیغامبر ٹھیرا کر اپنی آرزوئیں اور مُرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیّات عشق مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی اور زُلف و خال و خط سے شاہد مطلق کے شیون اور صفات مراد لینی زیادہ دلکش اور موثر ہیں بہ نسبت اِس کے کہ کھُلی سورٹھ گائی جائے- یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اِس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزون طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں- حضرت

مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران	گفتہ آید در حدیثِ دیگران

اسی طرح واعظ۔ زاہد۔ شیخ۔ قاضی۔ صوفی۔ محتسب۔ اور ایسے اشخاص کو جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے۔ ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑنا اور رند اوباش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف باطنی، آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزے دار ہے۔ اور زیادہ توجہ سے سُنا جاتا ہے۔

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدما کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن شیخ کے ہاں اوّل تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حُسن بیان نے اُن کو بہت بامزہ اور لطف انگیز کر دیا ہے۔ شیخ کے بعد اوّل حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیّت میں شیخ کا تتبع کیا ہے کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ملتان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی زندگی ہی میں بھیج دیئے تھے۔ اس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی۔ اور شاعری میں ترقی کرنے کے لئے اُن کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصنافِ سخن میں جیسا کہ مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

"خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت	شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود"

نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانے کی غزلوں کا نام غزلیاتِ قدیم اور جوانی اور کہولت کی غزلیات کا نام طیّبات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیئے ہیں۔ تحفۃ الصّغر۔ وسط الحیوٰۃ۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ اِن قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر اُنہیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اوّل شیخ نے چمکایا تھا۔ مگر اُن میں بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انہیں کا حصہ ہو گئے ہیں جیسے تصوّف شراب۔ اہل ظاہر پر خردہ گیری دُنیا کی بے ثباتی۔ عقل و تدبیر کی توہین عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔

نہ سپہر کے اشعار یہ ہیں

کس نہ بیند سوئے نظم دلگیر	کہ نگردد بدلے منزل گیر
چون نماند بہ دل خلقے یاد	گرچہ شد زادہ ہمان دان کہ نزاد
تا بجائے کہ حد پارسیان	اندرین عہد دو تن گشت عیان
زان یکے سعدی و ثانیش ہمام	ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوے دگر یارے ہست	شعر شان ہست بدان گونہ کہ ہست

اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں۔ جن میں مضامین مذکورۂ بالا زیادہ تر باندھے گئے ہیں

برخیز تا یکسو نہیم این دلق ازرق فام را	بر باد قلّاشی دہیم این شرک تقوی نام را

مے باجوانان خوردنم خاطر تمنا میکند — تا کودکان در پے فتند این پیر دُرد آشام را
زین تنگنای خلوتم خاطر بہ صحرا مے کشد — کز بوستان باد سحر خوش میدہد پیغام را
غافل مباش ار عاقلی دریاب گر صاحبدلی — باشد کہ نتوان یافتن دیگر چنین ایام را
جائیکہ سرو بوستان باپایے چوبین میرود — ما نیز در رقص آوریم آن سرو سیم اندام را

وقت طرب خوش یافتیم آن دلبر طناز را — ساقی بیار آن جام مے مطرب بساز آن ساز را
امشب کہ بزم عارفان از شمع رویت روشن است — آہستہ تا نبود خبر رندان شاہد باز را
روی خوش و آواز خوش دارند ہر یک لذتے — بنگر کہ لذت چون بود محبوب خوش آواز را

جان ندارد ہر کہ جانانیش نیست — تنگ عیش ست آنکہ بستانیش نیست
گر دلے داری بدلدارے سپار — ضائع آن کشور کہ سلطانیش نیست
ماجرائے عقل پُرسیدم ز عشق — گفت معزول ست و فرمانیش نیست
درد عشق از تندرستی خوشتر ست — گرچہ غیر از صبر درمانیش نیست

چنان بموی تو آشفتہ ام ببوی مست — کہ نیستم خبر از ہرچہ در دو عالم ہست
دگر بروی کسم دیدہ بر نمے باشد — خلیل من ہمہ بُت ہائے آزری بشکست
غلام ہمت آنم کہ پائے بند یکیست — بجانبے متعلق شد از ہزار برست
نگاہ من بتو و دیگران بتو مشغول — معاشران ز مے و عارفان ز ساقی مست
برادران و عزیزان نصیحتم نکنید — کہ اختیار من از دست رفت و تیر از شست

خوشتر از دوران عشق ایام نیست / بامدادِ عاشقان را شام نیست
مطربان رفتند و صوفی در سماع / عشق را آغاز هست انجام نیست
از هزاران در یکے گیرد سماع / زانکه هر کس محرمِ پیغام نیست
هر کسے را نام معشوقی که هست / میبرد معشوقِ ما را نام نیست
باد صبح و خاکِ شیراز آتشے ست / هر که او در وے گرفت آرام نیست
سعدیا چُوں بُت شکستی خود مباش / خود پرستی کمتر از اصنام نیست

دلے که عاشق و صابر بود مگر سنگست / ز عشق تا به صبوری هزار فرسنگست
برادرانِ طریقت نصیحتم مکنید / که توبه در رهِ عشق آبگینه و سنگست
دگر به خفیه نمے بایدم شراب و سماع / که نیک نامی در دینِ عاشقان ننگست
چه تربیت شنوم یا چه مصلحت بینم / مرا که چشم بساقی و گوش بر چنگست
بخشم رفتهٔ ما را که میبرد پیغام / بیا که ما سپر انداختیم گر جنگست
بیادگار کسے دامنِ نسیم صباح / گرفته ایم و چه حاصل که باد در چنگست
بکش چنانکه تو دانی که بے مشاهده ات / فراخنای جهان بر وجودِ ما تنگست
ملامت از دلِ سعدی فرو نشوید عشق / سیاهی از حبشی چون رود که خود رنگست

دوش بے روی تو آتش بسرم بر می شد / آبم از دیده همی رفت و زمین تر می شد
تا به افسوس بپایان نرود عمر عزیز / همه شب ذکر تو میرفت و مکرّر می شد
چشم مجنون چو بخفتے همه لیلی دیدے / مدعی بود گرش خواب میسّر می شد

یارب آن صبح کجا رفت کہ شبہائے دگر
سعدیا عقدِ ثریا مگر امشب بگسیخت

نفسے میزد و آفاق منوّر مے شد
ورنہ ہر شب ز گریبان سحر بر مے شد

منقلّب درونِ جامۂ ناز
جہد کردم کہ دل بکس ندہم
محتسب در رفقاے رندان ست

چہ خبر دارد از شبانِ دراز
چہ توان کرد با دو دیدۂ باز
غافل از صوفیانِ شاہد باز

از تو با مصلحتِ خویش نمی پروازم
گر تو خواہی کہ بجوئی دلم امروز بجوی
من خراباتی و دیوانہ ام و عاشق و بس
ماجرائے دلِ دیوانہ بگفتم بہ طبیب
گفت زین نوع شکایت کہ تو داری سعدی

ہمچو پروانہ کہ می سوزم و در پروازم
ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم
بیشتر زین چہ حکایت بکند غمازم
کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم
دردِ عشق ست ندانم کہ چہ درمان سازم

بر خیز تا طریقِ تکلّف رہا کنیم
گر دیگر آن نگار قباپوش بگزرد

دکّانِ معرفت بدو جو بر بہا کنیم
مانیز جامہاے تصوّف قبا کنیم

ساقیا مے دہ کہ ما دردے کش میخانہ ایم
خویشتن سوزیم و جان بر سر نہادہ شمع وار
اہلِ دانش را درین گفتار با ما کار نیست

با خرابات آشنائیم و از خرد بیگانہ ایم
ہر کجا در مجلسے شمعے ست ما پروانہ ایم
عاقلان را کے زیان دارد کہ ما دیوانہ ایم

خلق میگویند جاه و فضل در فرزانگیست
عیب تست از چشم گوهر بین نداری ورنه ما

گو مباش انیها که ما رندانِ نافرزانه ایم
هر یک اندر بحرِ معنی گوهرِ یک دانه ایم

دو چشم مست میگویندش ببرد آرام هشیاران
نصیحت گوی را از من بگو اینجا چه دم درکش
چه بولیست آنکه عقل از من ببرد و صبر و هشیاری
تو با این مردم کوته نظر در چاه کنعانی

دو خواب آلوده بربودند عقل از دستِ بیداران
سیهل از سر گذشت آنرا که میترسانی از باران
ندانم باغ فردوس است و یا بازارِ عطاران
بمصر آما پدید آیند یوسف را خریداران

ای که ز دیده غایبی در دل ما نشستهٔ
خاطرِ عام بردهٔ خونِ خواص خوردهٔ

حُسنِ تو جلوه میکند وین همه پرده بستهٔ
ما همه صید کردهٔ خود ز کمند جستهٔ

می برزند ز مشرقِ شمع فلک زبانه
عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش
صوفی چگونه گردد گرد شراب صافی
آن کوزه بر کفم نه کآب حیات دارد
گرمی بجان دهندت بستان که پیش دانا

ای ساقیِ صبوحی در دهِ می شبانه
هوشم ببر زمانے تا کے غمِ زمانه
گنجشک را نه گنجد عنقا در آشیانه
هم طعمِ نار دارد هم رنگِ نار دانه
ز آبِ حیات خوشتر خاکِ شراب خانه

هر روز باد می برد از بوستان گلے
روئیست ماه پیکر و موئیست مشکبوی

مجروح میکند دل مسکین بلبلے
هر لالهٔ که میدمد از خاک و سنبلے

بالای خاک هیچ عمارت نکرده اند
مکروه طلعتی ست جهانِ فریبناک
وے بوستان و خرّم صحرا و لاله زار
وامروز خارهای مغیلان کشیده تیغ
دُنیا پلی ست رهگذرِ دارِ آخرت

گر زوے بدیر و زود نباشد تحوّلے
بر بامداد کرده به شوخی تجمّلے
وز بانگِ مُرغ در چمن اُفتاده غلغلے
گوئی که خود نبود درین بوستان گلے
اہل تمیز خانه نگیرند بر پُلے

ایکه آگاه نهٔ عالمِ درویشان را
گنج آزادگی و کُنجِ قناعت ملکی ست
طلب منصبِ فانی نکند صاحب عقل
جمع کردند نهادند بحسرت رفتند
در ازل بود که پیمانِ محبّت بستند
عاشقے سوخته بے سر و سامان دیدم
نفسے سر برآورده ضعیف از سر درد
پند دلبند تو در گوش من آید هیهات
سعدیا عمر عزیز ست بغفلت مگذار

تو چه دانی که چه سودا به سر ست ایشانرا
که بشمشیر میسّر نشود سلطان را
عاقل آنست که اندیشه کند پایان را
وین چه دارد که بحسرت نگذارد آن را
نشکنند مرد گرش سر برود پیمان را
گفتم اے یار بکن در سرِ فکرت جان را
گفت بگذار من بے سر و بے سامان را
منکه بر درد حریصم چه کنم درمان را
وقت فرصت نشود فوت مگر نادان را

لاابالی چه کند دفترِ دانائی را
دیده را فائده آنست که دلبر بیند
همه دانند که من سبزهٔ خط دارم دوست

طاقتِ وعظ نباشد سرِ سودائی را
ورنه بیند چه بود فائده بینائی را
نه چو حیوان که خورد سبزهٔ صحرائی را

سعدیا نوبتی امشب دہلِ صبح نکوفت | یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

شبے وشمعے وگوینده وزیبائے | ندارم از ہمہ عالم جز این تمنّائے
فرشتہ رشک برد بر جمال مجلسِ من | گر التفات کند چون تو مجلس آرائے
ضرورتست بلا دیدن وجفا بردن | زدستِ آنکہ ندارد بحسن ہمسائے
قیامت ست کہ درروزگار ما برخاست | براستی کہ بلائیست آن نہ بالائے
وگرچہ بینی اگر روا نزد بگردانی | کہ نیست خوشتر از و در جہان تماشائے
وگر کنی نظر از دُور کن کہ نزدیکست | کہ سر ببازی اگر بیشتر نہی پائے

عالم کہ عارفان راگوید نظر بدوزند | گر یار ما بہ بیند صاحب نظر بباشد
زیرا کہ بادشاہے چون بقعۂ بگیرد | بنیاد حکمِ اوّل زیر وزبر بباشد
دیوانہ راکہ گوئی ہشیار باش و عاقل | ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر بباشد
ساقی بیار جامے مطرب بگوی چیزی | لب بر دہانِ نے نہ تا نیشکر بباشد

ببوئے لف تو با باد عیش ہا دارم | اگرچہ عیب کنندم کہ باد پیمائیست
ترا ملامتِ سعدی حلال کے باشد | کہ برکناری واو درمیانِ دریائیست

الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا۔ اور عشق مجازی کے متعلّق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں۔ جو عام عشقبازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں شیخ نے غزل میں ایسی باتیں کم لکھی

ہیں۔ بلکہ وہ اکثر عشق ومحبّت کے پوشیدہ اسرار وغوامض اور عمیق کیفیّات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلبستگی کے زمانے میں ہر انسان پر گذرتے ہیں لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کرسکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گذر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشقبازوں اور ابوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے۔ کہ وصل کی اُمید پر جُدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے ؎

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست	گر امید وصل باشد آنچنان دشوار نیست

یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے وہ عموماً عشق ومحبّت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں۔ اور اُس موقع کو یاد کرکے پچتاتے ہیں جبکہ دلبستگی کے سامان اُنہوں نے خود مہیا کئے تھے۔ اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سنّنے یا ربط بڑھانے سے ایک مُردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا۔ لیکن اُن کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے۔ کہ اِس جلن اور سوزش میں کس قدر لذّت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اگر بالفرض ترک عشق ومحبّت پر اُن کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اِس دلبند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کرسکتے۔ جیسا کہ شیخ نے کہا ہے ؎

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را	از ذوق اندرونش پروائے رہا شد

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہونا اور جب تک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ گریہ بات بہت

کم خیال میں گذرتی ہے کہ عشّاق کو بسا اوقات ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ جیسا کہ شیخ کہتا ہے ؎

دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست	تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی

یا مثلاً عشّاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدّت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ شکوہ شکایت اور جُدائی کی مُصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس واقعی کیفیّت سے بیخبر ہوتے ہیں۔ کہ جب دوست سے مُلاقات ہوتی ہے تو اُس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جُدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں چنانچہ شیخ نے اِس مضمون کو یُوں بیان کیا ہے ؎

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم	چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معرّا تھی۔ اوّل شیخ ہی نے اِن مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوّف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذّت اور نمک اور درد بھر دیا۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اُس کے بعد مُتغزّلین نے وہی اُصول اختیار کئے کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اِس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر موزون طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ از انجملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکّہ جمایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے

باخبر تھے۔ یا راگ راگنی سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے۔ سب جان و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں حال و قال کی مجلسوں میں۔ قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں۔ شعرا کی صحبتوں میں مشائخ کے حلقوں میں در و دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت کے مضامین نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اِس بادۂ ہوش ربا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق۔ خیالات۔ اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مترتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلّق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاً شعور نہیں ہوتا اور جسقدر شعر میں نمک اور حُسن زیادہ ہوتا ہے اُسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی۔ خواجہ حافظ۔ امیر خسرو۔ میر حسن سنجری۔ مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔

اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوّف پر مبنی ہے۔ لیکن اُس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں جس طرح اُس سے ایک صُوفی خدا پرست روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اسی طرح ایک بوالہوس صوت پرست کے

نفسانی جذبات اُس کے سننے اور پڑھنے سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے مال و دولت علم و ہنر۔ نماز روزہ۔ حج و زکوٰۃ۔ زہد و تقویٰ غرضیکہ کسی شئے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھیراتی۔ وہ عقل و تدبیر مآل اندیشی۔ تمکین و وقار۔ ننگ و ناموس جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ اور آوارگی۔ رسوائی۔ بدنامی۔ بدمستی بے سر و سامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دُنیا پر لات مارنا عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا توکل و قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا۔ دُنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصوّر باندھے رکھنا علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا۔ حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا۔ کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رائگان کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے اُن کو لے اڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دو چند بلکہ دس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود اِن سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اِس کلام کے قائل اکابر صوفیہ و مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف

کے بیان کرنے میں گذری ہے اور جس کا شعر شریعت کا لُب لُباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی دلنشین زیادہ ہوتے ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر اُن صفات سے موصوف پاتے ہیں۔ جن کی اِس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی حُسن پرستی اُن کے ساتھ اِس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اِس کا چسکا رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمّر لوگ بھی اُس کا دم بھرتے ہیں۔ فضول خرچی۔ ناعاقبت اندیشی۔ عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا۔ توکّل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی۔ غیر قوموں کی ترقّی کا ذکر سُن کر دُنیا و مافیہا کو ہیچ و پوچ بتانا۔ عقل انسانی کو حقایق اشیا کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اِسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اِس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن اِس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اِس حالت کو ترقّی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے۔

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ ریویو مورخہ جون ۱۸۵۶ء میں خواجہ حافظ کا حال لکھا ہے اُس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔ جس کا نقل کرنا اِس مقام پر شاید بے موقع نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے۔ ایک روز

وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا۔ جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اُسی وقت سعدی کسی کام کے لئے وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔ حافظ نے اُس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگاکر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی۔ اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آکر حافظ کو نہ پایا مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی۔ سعدی اِس بات سے ناخوش ہُوا اور حافظ کو بلا کر پُوچھا کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں۔ شیخ نے اُس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سُنی تو اُس کو بد دعا دی کہ جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہیگا۔ اِس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعی مسلمان اِس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بد دعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی۔ کیونکہ اُس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے۔" مَیں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگا پیچھا ہے۔ قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اِس اعتبار سے صحیح ہے۔ کہ خواجہ حافظ کی غزل کی مُمارست اور مزاولت سے بیشک ابرار واحرار کے دلوں میں دُنیا کی بے ثباتی اور توکّل واستغنا وقناعت کا نہایت پُختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اوباش والواط کو بیفکری۔ نا عاقبت اندیشی۔ عشقبازی۔ بدنامی ورسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی

ویسی ہی خانہ برانداز اور خانمان سوز ہے۔ جیسی دوسری۔ ہر زمانے کا جُدا جُدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت مند اور ذی اقتدار لوگ دُنیا طلبی اور حُبِّ جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرّتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطّل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں۔ اُس وقت البتّہ یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ تمام قوم کم ہمّت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو اور اُلوالعزمی کا تخم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو اور جبکہ تمام دُنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دُنیا سے اُن کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹاتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گُل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے اُس زمانے میں جبکہ مسلمانوں کے دماغ میں نشہ جاہ دنیوی عروج پر تھا۔ کچھ مفید نتائج پیدا کئے ہوں۔ لیکن اِس زمانے میں میرے نزدیک اِس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔

اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اِس سے اُن کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہے لوگ اُس سے متاثر ہوں نہ یہ کہ اس سے کبھی مضر نتائج پیدا نہ ہونے پائیں۔ باروت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں۔ اور شراب نے بےشمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں باایںہمہ اِن کے موجدوں کی دانشمندی کا تمام دُنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی۔

قصائد وغیرہ

اِس مجموعے میں شیخ کے مدحیہّ قصیدے۔ مرثیے۔ ترجیع بند ملمعّ اور مثلث جمع کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اُس کی طبیعت ہی کو قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گون نہ تھی۔ اور یا اُس نے مدح وستایش کے طریقہ مروّجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا مگر چونکہ اُس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا۔ کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ اِس لئے اُس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں۔

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مداحی کی مسلمانوں میں تھی اُس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عبّاسی خلیفہ بغداد کے زمانے سے شعرا کو نہایت گرانبہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مِل جاتے تھے خُلفا اور امرا کو اپنی تعریفیں سُننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا۔ کہ اُن کا مدّاح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو اُن کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ اور اگر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال وخط کی تعریف میں خرچ کر دیتے ہیں۔ صرف کچھ بچے کچے خیالات ہمارے سر مارتے ہیں۔ ہزاروں علما وفضلا نے قصیدہ گوئی اور مداحی کو اپنا پیشہ ٹھیرا لیا تھا۔ اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدّح سرائی میں خامہ فرسائی کرے۔ شعرا تمام ممالک اسلامیہ

میں اس اُمید پر سفر کرتے تھے۔ اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے۔

عبّاسیوں کے علاوہ فاطمی۔ دیلمی۔ کروی۔ طاہری۔ صفاری۔ سامانی۔ غزنوی۔ سلجوقی۔ خوارزم شاہی وغیرہ تمام سلسلوں میں مدّاحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور و شور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر آٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا۔ ظہیر۔ رشید۔ خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں متنبّی۔ ابو تمام۔ بحتّری اور ذوالرمّہ نے حاصل کی تھی۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و اُمرائے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا۔ جیسے درباریوں کو جشن اور تہوار میں نذر دکھانا مگر قصیدے کی حالت اُس وقت ایسی بُری تھی کہ شیخ کو اپنی جبلّی استقامت اور سنجیدگی کے سبب اُس روش پر چلنا دشوار تھا۔ ممدوح کی ستائش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کئے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلّفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی۔ مسائل علمیہ اور مقاماتِ حکمیہ اور سلوک و تصوّف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی اصطلاحیں اظہار علم و فضل کے لئے ان میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں۔ صنائع لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزادی اور حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی۔ ان تکلّفاتِ لایعنی سے مانع تھی۔ اُس کے کلام

سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے	تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

شیخ بوستان میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریض کرتا ہے ؎

براہ تکلّف مرو سعدیا	اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو	تو حق گو و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسمان	نہی زیر پائے قزل ارسلان
مگو پائے عزّت بر افلاک نہ	بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

اِس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مدّاح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ" لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اُٹھاتا ہے۔ اور کیوں اپنے کمال شاعری سے متمتع نہیں ہوتا؟ اگر تو مدّح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب دریوزہ گروں کی طرح لے جاؤں۔ اگر ایک جو بھر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو تو خزانے بخشدے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابل نفرین "

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغہ اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا اُس کے حاصل کرنے میں

مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا
تھا۔ اور اپنے دوستوں کو اِس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اِس بات
کی کچھ پروا نہ تھی۔ کہ قصیدہ کو مقبول خاص و عام بنائے اور اِس ذریعہ سے دربار
میں تقرب حاصل کرے۔ جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گذرے ہیں سب بادشاہوں
کے ہاں اِس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریبوں میں طوفان کے تودے
بنا کر لائیں اور اُن میں جس قدر زیادہ مبالغہ اور جھوٹ کو کام فرمائیں اُسی قدر گرانبہا
صلے اور انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیر قزل ارسلان کے ہاں۔ انوری سنجر کے ہاں۔ رشید
وطواط خوارزم شاہ اُتسز کے ہاں۔ اور خاقانی شروانشاہ کے ہاں ملک الشعرا تھے۔
اِن لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور اُن کی ترقی
اور تقرب کا مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانہ میں قصیدہ گوئی کے لئے ضروری
تھیں یہی سبب ہے کہ قصیدے کے سوا کوئی بڑی یادگار اُنہوں نے نہیں چھوڑی۔
پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانہ کے دستور کے موافق
کچھ نہ کچھ قصیدہ کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو ویسے جھوٹے اور نمائشی طلسم
باندھنے کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں۔ اِسی لئے
غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ مَیں ہرگز اِس امر کو
تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قُدرت نہ تھی۔
بلکہ میرے نزدیک جس طرح رولر ٹیڑھا خط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اسی طرح
طبیعت کی استقامت کبھی کج راہ نہیں چلنے دیتی۔ اِس میں شک نہیں کہ فارسی
میں جس قدر قصیدہ حدِ شاعری سے متجاوز ہو گیا ہے ایسی اور کوئی صنعت نہیں ہوئی۔

مدحیہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہئے۔ کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص و عام کے دل میں اُس کی محبّت اور اُس کے ساتھ حُسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہئے کہ اگر وہ صفتیں اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقّی کرے یا کم سے کم اُن کو اُسی حال پہ قائم رکھے اور اگر نہ ہو تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات کہ مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دِل میں اس مدح کی وقعت ایک ہجو ملیح سے زیادہ نہ ہو گی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلان کی مدح میں یہ لکھا ہے۔ کہ "تصوّر جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل ارسلان کی رکاب پر بوسہ دیتا ہے۔ اِس سے قزل ارسلان کے دل پر سوا اِس کے کہ اُس کو ایک ہجو ملیح سمجھا ہو اور کیا اثر ہوا ہو گا۔ یا مثلاً انوری جو مجدالدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے۔ کہ "اگر وہ زمانہ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانہ آئندہ کی جگہ آجائے" اِس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اِس کے کہ مدّاح مجھ کو بناتا ہے۔ یا میرا خاکا اُڑاتا ہے اور کیا خیال گذرا ہو گا۔ یہی حال اُن تمام قصیدہ گویوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔ شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرطِ کراہت کے سبب مدح و ستائش کے اِس ناپسندیدہ طریقہ کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اُسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلّفی کے ساتھ جو اُس کے کلام کی عام خاصیّت ہے لکھے ہیں۔ اُس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبّت

اور خلوص اور ولی جوش سے لکھے ہیں۔ نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلہ و انعام کی اُمید پر۔ باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطین عہد اور احکام وقت کی شان میں لکھے ہیں۔ اُن کے اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے اہل دُنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لئے قصیدہ کو اُن سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں۔ جو اُس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نامزد کئے ہیں۔ ان کے سوا اور قصیدوں میں اوّل مدح و ستایش کی چاٹ دے کر پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے۔

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اُس کی علّت غائی جو اُس نے قرار دی تھی۔ ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا۔ اور شیخ اُس کی رعایا میں سے تھا۔ اُس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے ؎

بنوبت اند ملوک اندرین سپنج سرائے — کنون کہ نوبت تست ایملک بعدل گرائے
چہ مایہ بر سر این ملک سروران بودند — چو دور عمر بسر شد در آمدند از پائے
نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس — بلند بانگ چہ سود و میان تہی چو درائے
بہ تیغ و نیزہ گرفتند جنگجویان ملک — تو بر و بحر گرفتی بعدل و ہمّت و رائے
چو ہمّت است چہ حاجت بہ گرز مغفر کوب — چو دولت است چہ حاجت بہ تیر جوشن خائے
عمل بیار کہ رختِ سرائے آخرت است — نہ عود سوز بکار آیدت نہ عنبر سائے

ہر آنکس ست کہ بہ آثارِ خلق فرماید
بکامۂ دلِ دشمن شنید آن مغرور
دیار مشرق و مغرب بگیر و جنگ مجوے
نگویمت چو زبان آورانِ رنگ آمیز
نکاہد آنچہ نوشتہ است عمر و نفزاید

عدوے مملکت است آن کش بتنش فرمائے
کہ بشنود سخن دشمنان و دوست نمائے
ولے بدست کن و زنگ خاطرے بروائے
کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زائے
پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بحشر بپائے

دوسرے قصیدہ میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابو بکر کی طرف اِس طرح خطاب کرتا ہے ؎

مدیح شیوۂ درویش نیست تا گویم
نگویمت کہ بفضل از کرام ممتازی
دگرچہ انیہمہ ہستی نصیحت اولیٰ تر
بسعی کوش کہ ناگہ فراغتت نبود
خدائے یوسف صدیق راعزیز نہ کرد
شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالت ہست
بقائے مملکت اندر وجود یک حرفست
پس از گرفتنِ عالم چو کوچ خواہد بود
بہ نیک و بد چو بباید گذشت آن بہتر
ہزار سال نگویم بقائے عمر تو باد
ہمین سعادت و توفیق بر مزیدت باد

کہ ہمچو بحر محیطی و ابر آذاری
نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
کہ پند راہ خلاص است و دوستی یاری
کہ شہر بخاری۔ اگر روے شیر نر خاری
بنحو بروی۔ ولیکن بخوب کرداری
ولے بکار نیاید بجز نکوکاری
کہ دست ہیچ قوی بر ضعیف نگماری
رواست گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری
کہ نیک نام بدست آوری و بگذاری
کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری
کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری

اتابک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ جو اتابکون کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ

گذرا ہے۔اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اُس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے ؎

مرادِ سعدی از انشاد و زحمتِ خدمت
دوامِ دولت و آرامِ مملکت خواہی
کمر بطاعت و انصاف و عدل و عفو بہ بند
تو روشن آئینۂ ز آہِ دردمند بہ ترس
معلّمان بد آموز را سخن مشنو

نصیحت است بسمع قبول شاہنشاہ
ثباتِ راحت و امنِ مزید و رفعت و جاہ
چو دست رحمتِ حق بر سرت نہادہ کلاہ
عزیز من! کہ اثر میکند در آئینہ آہ
کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خان یعنی ہلاکو خان یا اُس کے بیٹے اباقا خان کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے مدّحیہ اشعار کہہ کر لکھتا ہے ؎

ہر نوبتے نظر بہ یکے مے کند سپہر
نیخے نشان کہ دولت باقیت بردہد
اے بادشاہ روئے زمین دور از آن تست
چون کام جاودان متصوّر نمے شود
نادان کہ بخل مے کند و گنج مے نہد
یارب تو ہر چہ رائے صوابست و فعل خیر
آہوئے طبع بندہ چنین مشک میدہد

ہر مدتے زمین بہ یکے میدہد امان
کاین باغ عمر گاہ بہارست و گہ خزان
اندیشۂ تقلب دوران کن و زمان
خرّم کسیکہ زندہ کند نام جاودان
مزدور دشمن است تو بر دوستان فشان
اندر دلِ تو افگن و بر دست وے بر آن
کز پارس میبرند بہ تاتارش ارمغان

سردار انکیانو جو خاندان اتابک کے زوال کے بعد سلطان اباقا خان پسر ہلاکو خان کے حکم سے فارس کا فرمانروا مقرر ہوا تھا۔اور اپنے قدیم تاتاری مذہب نہایت پختگی سے ثابت قدم تھا۔اُس کے شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے از انجملہ ایک

قصیدہ میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھا ہے ؎

حرامش باد ملک و بادشاہی	کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
عروسِ زشت زیبا کے توان کرد	و گر بر خود کند دیبائے معلم
اگر مردم ہمین بالا و ریش اند	بہ نیزہ نیز بر بستہ ست برچم
چنین پند از پدر نشیندہ باشی	الا گر ہوشیاری بشنو از عم
چہ چیز دانت مکرم کرد مخصوص	چنان زی در میانِ خلق عالم
کہ گر وقتے میانِ بادشاہیست	نباشد۔ ہمچناں باشی مکرم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ	سخن ملکے ست سعدی را مسلّم
مقامات از دو بیرون نیست فردا	بہشت جاودانی یا جہنّم

سلجوق شاہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اُس کی مدح کو ایک اور قصیدہ میں اِس طرح ختم کیا ہے ؎

جہان نماند و آثارِ مملکت ماند	بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
کہ ملک و دولتِ ضحاک بیگنہ آزار	نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
خطائے بندہ نگیری کہ مہتران و ملوک	شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم
خنک کسیکہ پس از وے حدیث خیر کنند	کہ جز حدیث نمی ماند از بنی آدم

اِن کے سوا جو قصیدے خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کے بھائی خواجہ علاء الدین جوینی اور مجد الدین رومی اور فخر الدین ابوبکر وغیرہم کی شان میں ہیں اُن میں مدح اکثر برائے نام ہے زیادہ تر نصیحت و پند ہے اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں اُن میں صرف نصائح و مواعظ یا فصل بہار کا

سماں یا معشوق کی تعریف یا حمد الٰہی وغیرہ مندرج ہے۔
ایک مختصر قصیدہ اوّل سے آخر تک بھی اِس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین
کو مدح اور نصیحت دونو کا ڈھنگ معلوم ہو ٥

مدّح وعظۂ مجد الدین رومی

جہان بر آب نہادست زندگی بر باد
غلامِ ہمّتِ آنم کہ دل برو نہ نہاد

جہان نماند و خرّم روان آدمئے
کہ باز ماند ازو در جہان بہ نیکی یاد

سرائے دولت باقی نعیم آخرتست
زمین سخت نگہ کُن چو مے نہی بنیاد

کدام عیش درین بوستان کہ بادِ اجل
ہمے بر آورد از بیخ قامتِ شمشاد

حیات عاریتے خانہ ایست در رہ سیل
چراغ عمر نہادہ است بر دریچہ باد

بسے بر آید و بے ما فرو شود خورشید
بہار گاہ خزان باشد و گہے مرداد

ہر آنچہ میگذرد دل منہ کہ دجلہ بسے
پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد

گرت نہ دست بر آید چو نخل باش کریم
ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد

بسے بدیدۂ حسرت ز پس نگاہ کند
کسیکہ برگ قیامت ز پیش نفرستاد

وجودِ خلق بدل میکنند ورنہ زمین
ہمان ولایت کیخسروست ملک قباد

چو طفل برہمہ بازید و برہمہ خندید
عجب تر آنکہ نہ گشتند دیگراں اُستاد

عروس ملک نکو روئے دختریست ولے
وفا نمے کند ایں سُست مہر با داماد

نہ خود سریر سلیمان بباد رفتے و بس
کہ ہر کجا کہ سریریست مے رود بر باد

ہمین نصیحت من گوش دار و نیکی کن
کہ دانم از پس مرگم کنی بہ نیکی یاد

نداشت چشم بصیرت که گرد کرد و نخورد	بهر دو گوی سعادت که صرف کرد و بداد
چنان که صاحب فرخنده رای مجدالدین	که بیخ اجر نشاند و بنای خیر نهاد
نگوئمت به تکلّف فلان بدولت و دین	سپهر مجد و معانی جهان دانش و داد
تو آن برادر صاحب دلی که مادر دهر	به سالها چو تو فرزند نیک بخت نزاد
به روزگار تو ایّام دست فتنه ببست	به یمن تو درِ اقبال بر جهان بکشاد
دلیل آنکه ترا از خدای نیک آید	بس است خلق جهان را که از تو نیک افتاد
یکی دعا گُفتمت بی رعونت از سر صدق	خدات در نفس آخرین بیامرزاد
تو هم زبان نه کنی گر بصدق دل گوئی	که آفرین خدا بر روان سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو شیخ نے سعد بن[1] ابوبکر کے مرثیہ میں لکھے ہیں اور جو کلیات میں غلطی سے امیر فخرالدین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے۔ بطور نمونہ کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

[1] - امیر فخرالدین ابوبکر اتابک ابوبکر کے اُمرائے نامدار میں سے تھا۔ جو ادنیٰ درجہ سے منصب امارت بلکہ مشارکتِ ملک تک پہنچا تھا اور سعد ابوبکر اتابک کا بیٹا تھا جس زمانہ میں ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد ابوبکر کو اظہار دوستی و خیرخواہی کے لئے بغداد میں بھیجا تھا۔ جب وہاں سے باعزاز تمام رخصت ہوا۔ تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سُنی جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اُس کو خوش ہونا چاہئے تھا۔ مگر اُس کو اِس خبر سے ایسا صدمہ ہوا۔ کہ راہ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور راستے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا۔ اُسکی سُنائونی جب شیراز میں آئی۔ تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے جیسا کہ ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اُس کا بیٹا اتابک محمد مظفر اُس کا جانشین ہوا - ۱۲

غریبان را دلِ از بہر تو خون ست — دلِ خویشان نمے دانم کہ چون ست

عنانِ گریہ چون شاید گرفتن — کہ از دستِ شکیبائی برون ست

مگر شاہنشہ اندر قلب لشکر — نمے آید کہ رایت سرنگون ست

شکیبائی مجو از جانِ مہجور — کہ بار از طاقتِ مسکین فزون ست

سکون در آتش سوزندہ گفتم — نشاید کرد۔ درمان ہم سکون ست

کہ دُنیا صاحبے بدعہد و خُونخوار — زمانہ مادرے بے مہر و دون ست

نہ اکنوں ست بر ما جور ایّام — کہ از دورانِ آدم تا کنون ست

نمی دانم حدیث نامہ چون است
ہمی بینم کہ عنوانش بخون است

بزرگان چشم و دل در انتظارند — عزیزان وقت و ساعت می شمارند

غلامان در و گوہر مے فشانند — کنیزان دست و ساعد می نگارند

ملک خان و مساق و بدر و ترخان — بر ہوا رانِ تازی برسوارند

کہ شاہنشاہ عادل سعد بوبکر — بہ ایوان شہنشاہی درآرند

حرم شادی کنان برطاق و ایوان — کہ ہر وارید بر تاجش ببارند

زمین مے گفت عیشے خوش گذاریم — ازان پس آسمان گفت ار گذارند

اُمید تاج و تختِ خُسروی بود — ازین غافل کہ تابوتش در آرند

چہ شد پاکیزہ رویان حرم را — کہ بر سرگاہ بر زیور غبارند

نشاید پارہ کردن زیور روئے — کہ مردم تختِ امرِ کردگارند

ولیکن با چنیں داغ جگر سوز — نمے شاید کہ فریادے ندارند

ولے شاید کہ مہجوران بگریند	روا باشد کہ مظلومان بزارند

نمے دانم حدیث نامہ چون ست
ہمی بینم کہ عنوانش بخون ست

پس از مرگِ جوانان گل مماناد	پس از گل در چمن بلبل مخواناد
کس اندر زندگانی قیمت دوست	نداند۔ کس چنین قیمت مداناد
سر آمد روزگار سعدِ بوبکر	خداوندش برحمت در رساناد
بہ تلخی رفت از دُنیائے شیرین	زلال کام در حلقش چکاناد
جزائے مُردہ رفتن در غریبی	شراب از دستِ پیغمبر ستاناد
درین گیتی مظفرّ شاہِ عادل	محمدؐ نام بر وارثش بماناد
سعادت پرتو نیکان دہادش	بخوئے صالحانش پرورا ناد
روانِ سعد را با جانِ بوبکر	بہ اوجِ رُوح و راحت گستراناد
بکامِ دوستان و بخت فیروز	بسے دوران دیگر بگزرا ناد

نمے دانم حدیث نامہ چون ست
ہمی بینم کہ عنوانش بخون ست

This is one of the best books of Halli.

Gh Hassan Naik
(Rahi)
Islamabad
Kashmir.

صاحبیّہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرّق اشعار کا سَو صفحہ کے قریب ہے جس میں قطعہ۔ رباعی۔ فرد۔ ملمع۔ مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحب دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی۔ اس لئے شیخ نے اس مجموعہ کا نام صاحبیّہ رکھا ہے۔

ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیّت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے بیشتر اشعار نصیحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں ؎

قطعات

ناکسان را فراستے ست عظیم
چون دو کس مشورت کنند بہم
گرچہ تاریک طبع و بدخویند
گوید این عیب من ہمی گویند

سگے شکایتِ ایام با یکے می گفت
نہ آشیانہ چو مرغان نہ غلّہ چون موران
گرم دہند خورم ورنہ میرم آزاد
مرا نہ برگ زمستان نہ عیش تابستان
نہ در ریاضت و خلوت مقام بیسازم
بہ لقمۂ کہ تناول کنم ز دست کسے
نہ بینیم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم
قناعتم صفت و بردباری آئینم
نہ ہمچو آدمیان خشمناک بنشینم
کفایت ست ہمین پوستین پارینہم
کہ جائیگاہ کلوخ ست و سنگ بالینم
روا ست گر بزنند بعد ازان بہ ژوپینم

چو گربہ ورنہ ربایم ز دست مردم چیز
ورا وفتادہ بود ریزہ ریزہ برچینیم

بجائے من کہ نشیند کہ در مقامِ رضا
برابرست گلستان و تل سرگینیم

مرا کہ سیرت ازین جنس و خوبدین صفت ست
چہ کردہ ام کہ سزاوار سنگ و نفرینیم

جواب داد کزیں بیش نعتِ خویش مگو
کہ خیرہ گشت ز وصفت زبانِ تحسینیم

ہمیں دو خصلت ملعون کفایتت کہ ترا
غریب دُشمن و مُردار خوار مے بینیم

نظر کردم بچشم رائے و تدبیر
ندیدم بہ ز خاموشی خصالے

نگویم لب بہ بند و دیدہ بردوز
و لیکن ہر مقامے را مقالے

زمانے بحث علم و درس و تنزیل
کہ باشد نفس انسان را کمالے

زمانے شعر و شطرنج و حکایت
کہ خاطر را بود دفع ملالے

خدا لیست آنکہ ذاتِ بے مثالش
نگردد ہرگز از حالے بحالے

راحت بعد از مشقت

رحم اللہ معشر الماضین
کہ بردی قدم سپر دندے

راحتِ نفس بندگان خدا ے
راحتِ جان خود شمر دندے

آن عزیزان چو زندہ می نشوند
کاش این ناکسان بمردندے

ہمدردی با بنی نوع

بس دست دعا بر آسمان بود
تا پائے بر آمدت بہ سنگے

اے گرگ نہ گفتمت کہ روزے
ناگہ بہ سرا وفتدت پلنگے

انجام ظالمان

حقوق پدران

اے طفل کہ دفعِ مگس از خود نتوانی — ہر چند کہ بالغ شدی آخر نہ ہمانی
شکرانۂ زور آوری روز جوانی — آنست کہ قدر پدر پیر بدانی

نشانِ رزاقی

صانعِ نقش بند بے مانند — کہ ہمہ نقش او نکو آید
رزقِ طائر نہاد در پر و بال — کہ بہر طعمۂ فرو آید
روزیِ عنکبوت را بہ مگس — پر وہد تا بہ نزد او آید

ولی خائن

الحق اُمنائے مال ایتام — ہمچون تو حلال زادہ یابند
ہرگز زن و مردِ کفر و اسلام — نفس از تو پلید تر نہ زایند
طفلانِ ترا پدر بمیراد — تا جور وصی بیاز مایند
اطفالِ عزیز ناز پرورد — از دست تو دست بر خدایند

ظالم محتاط در حق خود

امیر ما عسل از دستِ خلق می نخورد — کہ زہر در قدحِ انگبین تواند بود
عجب کہ در عسل از زہر میکند پرہیز — حذر نمیکند از تیر آہ زہر آلود

ترحم بر بیوگان

شنیدم کہ بیوہ زنے دردمند — ہمے گفت و رخ بر زمین مے نہاد
ہر آن کد خدا را کہ بر بیوہ زن — ترحم نباشد زنش بیوہ باد

ہر بد کہ بخود نمے پسندی — با کس مکن اے برادرِ من

گر مادرِ خویش دوست داری — دشنام مده به مادرِ من

مقابلت نکند با حجر به پیشانی — مگر کسے که تهوّر کند بنادانی
کس این خطا نه پسندد که دفعِ دشمن خود — توانی و نکنی یا کنی و نتوانی

شنیده ام که فقیهے به دشتبانے گفت — که ہیچ خربزه داری رسیده گفت آرے
ازین طرف دو به دانگے - گر اختیار کنی — وزآن - چہار به دانگے قیاس کن بارے
سوال کرد که چندین تفاوت از پئے چیست — که فرق نیست میان دو نوع بسیارے
بگفت ازانچه تو بینی حلال و ملکِ من است — نیامده ست بدستم بوجه آزارے
وزان دگر پدرانم بغارت آوردند — حرام را نبود نزدِ شرع مقدارے
فقیه گفت - حکایت دراز خواہی کرد — ازین حرامترت ہست صد به دینارے

ناسگان را وجوه پیرا نیست — مشفق و مہربانِ یک دگراند
لقمۂ درمیان شان انداز — که تهی گاه یک دگر بدرند

رباعیات

شب نیست که چشم آرزومند تو نیست — وین جانِ بلب رسیده دربند تو نیست
گر تو دگرے بجائے من بگزینی — من عہدِ تو نشکنم که مانندِ تو نیست

تاسف بر عمر رفتہ

ماہیِ اُمیدِ عمرم از شست برفت / بے فائدہ روزم چو شب سست برفت
عمرے کہ از و دمے بجانے ارزد / افسوس کہ رائگانم از دست برفت

انجام ظالم

از بس کہ بیازرد دل دشمن و دوست / گوئی بگناہ مسخ کردندش پوست
وقتے غم او بر دلہا بودے / اکنون ہمہ غم ہائے جہان بر دل اوست

فصلِ بہار

گویند ہوائے فصلِ آواز خوش است / بوئے گُل و بانگِ مُرغ گلزار خوش است
ابریشم زیر و نالۂ زار خوش است / اے بے خبران این ہمہ با یار خوش است

مجبوری عاشق

گویند مرد در پئے آن سرو بلند / انگشت نمائے خلق بودن تا چند
بے فائدہ پندم مدہ اے دانشمند / من چون نروم کہ مے برندم بہ کمند

خوفِ مرگ

آہو برہ را کہ شیر در پئے باشد / بیچارہ چہ اعتماد بر وے باشد
این ملح در آب چند تواند بود / وین برف در آفتاب تا کے باشد

توحید

آنرا کہ نظر بروئے ہر کس باشد / در دیدۂ صاحب نظران خس باشد
قاضی بہ دو شاہد بدہد فتوئ شرع / در مذہب عشق شاہدے بس باشد

ریاضت کن

مردان ہمہ عمر پارہ بر دوختہ اند / قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند

فردائے قیامت بگناہ ایشان را　　باشد نہ سوزند کہ خود سوختہ اند

بادوست بگرمابہ درم خلوت بود　　وان روئے گلنیش گلِ حمام آلود
گفتا دگر این روے کسے دارد دوست　　گفتم بگلِ آفتاب نتوان اندود

چون صورت خویشتن در آئینہ بدید　　وان کام و دہان و لب و دندان بگزید
میگفت چنانکہ میتوانست شنید　　بس جان بلب آمد کہ بدین لب نرسید

امشب نہ بیاضِ روز برمے آید　　نہ نالۂ مُرغانِ سحر مے آید
بیدار نشستہ ام نظر بر سرِ کوہ　　تا صبح کہ از سنگ بدر مے آید

وقتست کہ چشمِ فتنہ خوابش ببرد　　باد از رُخِ گل حُسن شبابش ببرد
گُل وقت رسیدن آب عطار ببرد　　عطار بوقت رفتن آبش ببرد

وقتِ گل و روز شادمانی آمد　　ہنگامِ نشاط و کامرانی آمد
آن شد کہ بسرما نتوانی آمد　　سرما شد و وقتِ مہربانی آمد

ماچاکر آنیم کہ دل بربا ید　　یا دل بکسے دہد کہ جان آسا ید
آنکس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کسست　　در ملک خدا اگر نباشد شاید

آن گُل که هنوز نو بدشت آمده بود
نشگفته تمام- باد مهرش بر بود
بیچاره بسے اُمید در خاطر داشت
اُمید دراز و عمر کوتاه چه سود

من دوش قضا یا رو قدر پشتم بود
نارنج زنخدان تو در مشتم بود
دیدم که همے گزم لب شیرینت
بیدار چه گشتم سر انگشتم بود

چون خیل تو صد باشد و خصم تو هزار
خود را به هلاک میسپاری زنهار
تا بتوانی بر آور از خصم دمار
چوں جنگ ندانی آشتی عیب مدار

نامردم اگر زنم سر از مهر تو باز
خواهی بکشم بجور و خواهی بنواز
در بگریزم ز دستت اے مایۂ ناز
هر جا که روم پیش تو مے آیم باز

تا سر نه کنم در سرت اے مایۂ ناز
کوته نه کنم ز دامنت دستِ نیاز
هر چند که راهم بتو دور است و دراز
در راه بمیرم و نگردم ز تو باز

گر بے خبران و عیب گویان از پس
منسوب کنندم بهوا و بهوس
آخر نه گناه است که من کردم و بس
منظور ملیح- دوست دارد همه کس

چون زهرۂ شیران بدرد نعره کوس
بر باد مده جانِ گرامی به فسوس

با آنکہ خصومت نتوان کرد بساز — دستے کہ بقوت نتوان برد ببوس

یا ہمچو ہمائے بر من افگن پر خویش — تا بندگیت کنم بجان و سر خویش
در لایقِ خدمتم ندانی بر خویش — گو من سر خویش گیرم و کشور خویش

ہمسایہ کہ میلِ طبع باشد سویش — فردوس برین بود سرا در کویش
دان را کہ نخواہی کہ بہ بینی رویش — دوزخ باشد بہشت در پہلویش

ہر سرو قدے کہ بگذرد در نظرم — در ہئیات او خیرہ بماند بصرم
چون من نتوانم کہ جوان گردم باز — آخر کم از آنکہ در جوانان نگرم

خود را بمقام شیر مے دانستم — چون خصم آمد بہ روبہے مانستم
گفتم۔ من و صبر۔ اگر بود روز فراق — چون واقعہ اُفتاد نتوانستم

شہباز ہمہ خلق نہان مے گریم — چشم از غمِ دل بر آسمان مے گریم
طفل از غم مُرغ رفتہ چوں گریہ کند — بر عمرِ گذشتہ ہمچنان مے گریم

چون ما و شما اقارب یک دگریم — بہ زبان نبود کہ پردۂ ہم ندریم
اے خواجہ تو عیب من مکن تا من نیز — عیب تو نگویم کہ یک از یک بتریم

گر بر رگ جان زشت آیدم تیرم　　چه خوشتر از آنکه پیش دستت میرم
دل با تو خصومت آرزو میکندم　　تا صلح کنی و در کنارت گیرم

می آئی و لطف کرمت مے بینم　　و آسائش جان و رقدمت مے بینم
واں وقت که غائبی همت مے بینم　　هر جا که نگه مے کنمت مے بینم

گفتم که دگر چشم به دلبر نه کنم　　صوفی شوم و گوش به منکر نه کنم
دیدم که خلاف طبع موزونِ من است　　توبه کردم که توبهٔ دیگر نه کنم

مه را ز فلک بطرف بام آوردن　　وز روم کلیسیا بشام آوردن
در وقتِ سحر نماز شام آوردن　　بتوان نتوان ترا بدام آوردن

نه سرو توان گفت نه خورشید و نه ماه　　آه از تو که در وصف نمی آئی آه
هر کس بر ہے میرود اندر طلبت　　گر ره بتو بودے نه بدے اینهمه راه

اے راه روان را گذر از کوے تو نه　　ما بیخبر از عشق و گذر سوے تو نه
هر تشنه که از دستِ تو بستاند آب　　از دستِ تو سیر گرد و از روے تو نه

اے یار کجائی که در آغوش نهٔ　　و امشب بر ما نشسته چون دوش نهٔ

اے سرو بلند و راحت جسم و روان　　ہرچند کہ غائبی فراموش نۂ

اے کاج نکردمے نگاہ از دیدہ　　بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ
تقصیر ز دل بود و گناہ از دیدہ　　آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

روزے دو سہ شد کہ بندہ ننواختۂ　　و اندیشہ بہ ذکر ما نہ پرداختۂ
زان مے ترسم کہ دشمنان اندیشند　　کز چشم عنایتم بینداختۂ

گفتم کہ کنم توبہ ز صاحب نظری　　باشد کہ بلائے عشق گردد سپری
چندانکہ نگہ مے کنم اے رشک پری　　بار دومین ز اوّلین خوب تری

گویند کہ دوش شحنگان تتری　　دزدے بگرفتند بصد حیلہ گری
امروز بہ آویختنش مے بردند　　میگفت رہا کن کہ گریبان بدری

گیرم کہ بہ فتواے خردمندی و رائے　　از دائرہ شرع برون ننہم پائے
بامیل کہ طبع مے کند چہ توان کرد　　عیبے ست کہ در من آفریدہ خدائے

مفردات

دانی چه گفته اند بنی عوف در عرب
نسل بریده به که موالید بی ادب

تو آتش به نی درزن و درگذر
که نه خشک در بیشه ماند نه تر

مروّت نه باشد بر افتاده زور
برد مُرغ دون دانه از پیش مور

خواهی که به طبعت همه کس دارد دوست
با هر که در او فتی چنان باش که او دست

گر راه نمائی همه عالم راه است
در دست نه گیری همه عالم چاه است

نهالی که سی سال گردد درخت
ز بیخش بر آرد یکی باد سخت

اگر نواب و سرهنگان هم از درگه برانندت
ازاں بهتر که در پهلوی مجهولی نشانندت

سلطان جو به منزلِ گدایان آید
گر بر سر بوریا نشیند شاید

گر ز هفت آسمان گزند آید
همه بر عضوِ درومند آید

اگر دندان نباشد نان توان خورد
مصیبت آن بود کت نان نباشد

منعم که نظر بحالِ درویش کند
چندانکه کرم کند طمع بیش کند

تواضع گرچه محمود است و فضل بیکران دارد
نشاید کرد بیش از حد که هیبت را زیان دارد

گفتم که بر آید آبی از چاه اُمید
افسوس که دلو نیز در چاه اُفتاد

بشکر آنکه تو در خانهٔ و اهلت پیش
نظر دریغ مدار از مسافر درویش

کوتہ نظران را نبود جز غم خویش
گر بلندست کسے دہد دشنام
بشنو کہ من نصیحت پیران شنودہ ام
از بہر دل کسے بدست آوردن
چو بد گفتی مباش ایمن ز بد گو
صاحب دل نیک سیرت و علّامہ
کرم بجائے فروماندگان چو بتوانی
مروی نہ بقوت است و شمشیر زنی
تو با مار روز و شب ۔ در باغ انسی
پائے ملخے نزد سلیمان بردن
من سخن راست نوشتم تو اگر راست بخوانی

صاحب نظران غم بیگانہ و خویش
بہ کہ ساکن دہی جواب سلام
پیش از تو خلق دیدہ و بیش از تو بودہ ام
مطبوع نباشد گرے آزردن
کہ بدرا کس نخواہد گفت نیکو
گو کفش دریدہ باش و خلقان جامہ
مروّت است نہ چندانکہ خود فرومانی
آنست کہ ظلمے کہ توانی نہ کنی
خلاف است اینکہ طول العہد نبیی
عیب است ولیکن ہنر است از مورے
جرم لجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

کتبت لیبقی الذکر فی امم بعدی
فیا ذا الجلال اغفر لکاتبہ السعدی

حق در عاقل و نادان
تحمل ۔
ناصح تجربہ کار
... دل آزاری
جزائے ۔
عالم مفلس ۔
اعتدال در سخا
تفسیر مردانگی ۔
استحکام دوستی ۔
... ضعفا ۔
نصیحت ناشنودن
ختم کلام ۔

مطائبات وہزلیات ومضحکات

شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اُس کے فضل وکمال وبزرگی کے بالکل منافی ہے اِس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اِس حصّہ میں اپنی شیخوخت اور تقدّس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بیباکی سے دِل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اُس شخص کا ہے جس کے نتائجِ افکار سے گلستان اور بوستان جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا ہی اُس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اُس کے اقوال وافعال کا تفاوت اور اختلاف اور اُن کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور قانون کے موافق سرزد نہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو اُس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچّہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصّہ آتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا۔ اور جب یہ صفت حد سے گذر جاتی ہے۔ تو اِس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اِس مجموعہ کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

اَلزَمَنِی بَعضُ اَبنَاءِ المُلُوکِ اَن اُصَنِّفَ لَہٗ کِتَاباً فِی الھَزلِ عَلےٰ طَرِیقِ السُّوزَنِی فَلَم اُجِبہُ فَھَدَّدَنِی بِالقَتلِ فَلِاَجلِ ذَالِکَ اُجِبتُ اَمرَہٗ وَاَنشَدتُ ھٰذِہِ الاَبیَاتِ وَاَنَا اَستَغفِرُ اللّٰہَ العَظِیم ؁

یعنی ایک بادشاہزادہ نے مجھ کو اِس بات پر مجبور کیا کہ مَیں اُس کے لئے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا اِس پر اُس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی۔ اِس لئے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے۔ اور مَیں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں؛

شیخ کا عذر جہانتک ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا۔ تاتار سے لے کر رُوم و مصر و حبش تک اُس کی جولانگاہ تھی۔ اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شُہرہ اُس کی زندگی ہی میں دُور دُور پہنچ گیا تھا۔ مسلمان امیرزادوں اور بادشاہوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تمسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ پس اگر کسی نالائق بادشاہزادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شُہرہ سُن کر اِس خیال سے کہ ہمیشہ گرمی صحبت کے لئے ایک مجموعۂ ہزل و فحش موجود رہے شیخ کو ان ہفوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور چونکہ اس مجموعہ میں صریح فحش اور علانیہ پھکڑّ کے سوا بامزا اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیّت ہے۔ بہت کم پائے جاتے ہیں اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُمنگ اور طبیعت کی اُمنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورۂ غزنویہ کے شعرا سے برابر چلی آتی تھی۔

اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر ہاجی اور ہزال حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے۔ اور اب تک جیسے حکیم انوری۔ حکیم خاقانی۔ حکیم شفائی۔ حکیم قاآنی وغیرہ وغیرہ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے۔ اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں۔ اور حکیم صاحب نے بھی باانیہمہ مشیخت و تقدس تنگ آکر اُس کے جواب میں ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے۔ جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعلائی گنجوی جو منوچہر شروان شاہ کے عہد پایۂ تخت کا ملک الشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مربّی اور خسر تھا۔ اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجو بازی ہوتی تھی۔ جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بُرائی سوسائٹی میں اسقدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے۔ اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جا سکتا جس کا وہ عیب فی نفسہٖ مستحق ہے۔

ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوان شباب میں جو شوخی اور بیباکی کا زمانہ ہے کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا۔ مگر چونکہ وہ زمرۂ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا۔

اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اِس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکاً و تیمناً کلیات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستان کے مرتّب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ اِس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کئے ہیں۔

ہم کو بہت تجسس سے چند رُباعیاں اور قطعے اِس مجموعہ میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؛

رباعیات

آن عہد بیاد داری و دولت داد کز عاشق بیچارہ نئے کردی یاد
انگہ بگذ بختی کہ کس چوں تو نبود وامروز بیادی کہ کس چوں تو مباد

آن ماہ کہ گفتی ملکِ رحمان است این بار اگرش نگہ کنی شیطان است
روئے کہ چو آتش بزمستان خوش بود امروز چو پوستین بہ تابستان است

قطعات

چو خویشتن نتواند کہ مے خورد قاضی ضرورت ست کہ بر دیگران بگیرد سخت
کہ گفت پیرہ زن از میوہ میکند پرہیز دروغ گفت۔ کہ دستش نمیرسد بہ درخت

مرو کے غرفہ بود در جیحون	گز سمرقند بود پندارم
بانگ می کرد و زار مے نالید	کاے دریغا کلاہ و دستارم

حریف عمر بسر بردہ در فسوق و فجور	بوقت مرگ پشیمان ہمی خورد سوگند
کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد	توخود دگر نتوانی بریش خویش مخند

عربی قصائد اور مقطعات

کلیاتِ شیخ میں بیس۲۰ صفحہ کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں۔ اور اِن کے سوا اُس کے ملمّعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں گلستان میں بھی جیسا کہ اُس نے خاتمہ میں تصریح کی ہے تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظر اِس سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصّہ دیارِ عرب میں بسر ہُوا تھا اور عربی زبان بمنزلہ مادری زبان کے ہوگئی تھی اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوّف اور علم ادب میں مصروف کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے مگر جس قدر ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مشّاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیئے باایںہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا ادّعا نہیں کرتا۔ چنانچہ بغداد کے مرثیہ میں لکھتا ہے ؎

وَبِالشِّعْرِ اَیْمُ اللهِ لَسْتُ بِمُدَّعٍ	بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا۔
وَلَوْ کَانَ عِنْدِیْ مَا بِبَابِلِ مِنْ سِحْرٍ	اگرچہ میرے کلام میں وہ جادُو موجود ہے جو بابل میں موجود تھا۔

هُنَالِكَ نَقَّادُونَ عِلْمًا وَّ خُبْرَةً
وَمُنْتَخِبُو الْقَوْلِ الْجَمِيْلِ مِنَ الْهُجْرِ

یہاں علم اور واقفیت کی رُو سے پرکھنے والے اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے چھانٹنے والے موجود ہیں ⁂

جَرَتْ عَبَرَاتِيْ فَوْقَ خَدِّيْ كَآبَةً
فَاَنْشَأْتُ هٰذَا فِيْ قَضِيَّةِ مَا يَجْرِيْ

سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرہ پر ٹپک پڑے - سو میں نے یہ قصیدہ اس سرگذشت کے بیان میں لکھ لیا ⁂

وَلَوْ سَبَقَتْنِيْ مَسَادَةٌ جَلَّ قَدْرُهُمْ
لَمَا حَسُنَتْ مِنِّيْ مُجَاوَزَةُ الْقَدْرِ

اگر ذی رُتبہ لوگ اِس مضمون میں مجھ سے سبقت کرتے تو البتّہ مجھ کو اپنے رُتبہ سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا ⁂

بہرحال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اِس سے شیخ کی شاعری کا رُتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدہ میں سے جو کہ اُس نے خرابیٔ بغداد پر لکھا ہے کچھ اشعار بطور نمونہ کے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں -

حَبَسْتُ بِجَفْنِيْ الْمَدَامِعَ لَا تَجْرِيْ
فَلَمَّا طَغَى الْمَاءُ اسْتَطَالَ عَلَى السِّكْرِ

مَیں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا کہ بہنے نہ پائیں پر جب پانی نے طغیانی کی تو اُس بند کو توڑ ڈالا ⁂

نَسِيْمُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِهَا
تَمَنَّيْتُ لَوْ كَانَتْ تَمُرُّ عَلَى قَبْرِيْ
لِاَنَّ هَلَاكَ النَّفْسِ عِنْدَ اُولِي النُّهٰى
اَحَبُّ لَهُمْ مِنْ عَيْشِ مُنْقَبِضِ الصَّدْرِ

کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اُس کی ہوا کا جھوکا میری قبر پر گذرتا - کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مرجانا تنگدل جینے سے بہتر ہے ⁂

زَجَرتُ طَبِيبًا عَسَّ نَبضِي مُدَاوِيًا
اِلَیكَ فَمَا شَكوَایَ مِن مَرَضٍ یَبرِی

میں نے طبیب کو جبکہ اُس نے علاج کے لئے میری نبض کو چھوا جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے ؛

لَزِمتُ اصطِبَارًا حَیثُ كُنتُ مُفَارِقًا
وَهٰذَا فِرَاقٌ لَا یُعَالَجُ بِالصَّبرِ

میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج صبر سے ممکن نہیں ؛

وَلَا تَسأَلَنْ عَمَّا جَرٰی یَومَ حَصرِهِم
وَذٰلِكَ مِمَّا لَیسَ یَدخُلُ فِی حَصرٍ

نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا یہ وہ حال ہے ۔ جو قید بیان میں نہیں آ سکتا ؛

اُدِیرَتْ كُؤُوسُ المَوتِ حَتّٰی كَأَنَّهُ
رُءُوسُ الاُسَارٰی تَحَرَّكنَ مِنَ السُّكرِ

شراب مرگ کے جام گردش میں لائے گئے یہاں تک کہ قیدی کُشتوں کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جنبش کر رہے ہیں ؛

بَكَتْ جُدُرُ المُستَنصِرِیَّةِ نُهبَةً
عَلَی العُلَمَاءِ الرَّاسِخِینَ ذَوِی الحِجرِ

علمائے راسخین پر جو کہ اصحاب عقل و دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں ؛

مَحَابِرُ تَبكِی بَعدَهُم بِسَوَادِهَا
وَبَعضُ قُلُوبِ النَّاسِ اَملَكُ مِن جِبرٍ

اُن کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے آنسوؤں سے روتی ہیں مگر بعض لوگوں کے

دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں ؛

نَوَائِبُ دَهْرٍ لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَهَا
وَلَمْ أَرَ عُدْوَانَ السَّفِيهِ عَلَى الْحَبْرِ

یہ زمانہ کے سخت حادثے ہیں کاش میں ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانشمندوں پر نہ دیکھتا ؛

وَقَفْتُ بِعَبَّادَانَ أَرْقُبُ دِجْلَةً
كَمِثْلِ دَمٍ قَانٍ تَسِيلُ إِلَى الْبَحْرِ

میں نے شہر عبادان میں ٹھیر کر دجلہ کے پانی کو دیکھا کہ نکتر خون کی مانند سمندر کی طرف بہتا تھا ؛

وَفَائِضُ دَمْعِي فِي مُصِيبَةِ وَاسِطٍ
يَزِيدُ عَلَى مَدِّ الْبُحَيْرَةِ وَالْجَزْرِ

میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں جاری ہیں خلیج فارس کے مد و جزر کو اور بڑھا دیتے ہیں ؛

وَهَبْ أَنَّ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعُ عَامِرًا
وَيُغْسَلُ وَجْهُ الْعَارِفِينَ عَنِ الْعَفْرِ

فرض کرو کہ دارالخلافہ پھر آباد ہوا اور علماء کے چہرے غبار ذلت سے پاک کیئے جائیں ؛

فَأَيْنَ بَنُو الْعَبَّاسِ مُفْتَخَرُ الْوَرَى
ذَوُو الْخُلُقِ الْمَرْضِيِّ وَالْغُرَرِ الزُّهْرِ

لیکن بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں کہاں سے آئینگے ؛

غَدَا سَمَرًا بَيْنَ الْأَنَامِ حَدِيثُهُمْ
وَذَا سَمَرٌ يُدْمِي الْمَسَامِعَ كَالسُّمْرِ

ان کا ذکر دنیا میں ایک فسانہ ہو گیا اور یہ وہ فسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے ؛

وَفِي الْخَبَرِ الْمَرْوِيِّ دِيْنُ مُحَمَّدٍ
يَعُوْدُ غَرِيْبًا مِثْلَ مُبْتَدَءِ الْأَمْرِ

حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب ہونے والا ہے جیسا کہ ابتدائے حال میں وہ غریب تھا ؛

ءَاَغْرَبُ مِنْ هٰذَا يَعُوْدُ كَمَا بَدَا
وَسُبِّيَ دَارُ السِّلْمِ فِي بَدْءِ الْكُفْرِ

کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دار الاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہوگیا ؛

اَتُذْكَرُ فِي أَعْلَى الْمَنَابِرِ خُطْبَةً
وَمُسْتَعْصِمٌ بِاللّٰهِ لَمْ يَكُ فِي الذِّكْرِ

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائے گا اور مستعصم باللہ کا اُس میں ذکر نہ ہوگا ؛

ضَفَادِعُ حَوْلَ الْمَاءِ تَلْعَبُ فَرْحَةً
أَصَبْرٌ عَلٰى هٰذَا وَيُوْنُسُ فِي الْقَعْرِ

کیا اس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے اِدھر اُدھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو ؛

تَحِيَّةُ مُشْتَاقٍ وَأَلْفُ تَرَحُّمٍ
عَلَى الشُّهَدَاءِ الطَّاهِرِيْنَ مِنَ الْوِزْرِ

مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں اُن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے ؛

هَنِيْئًا لَهُمْ كَاسُ الْمَنِيَّةِ مُتْرَعًا
وَمَا فِيْهِ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ عِظَمِ الْأَجْرِ

موت کا لبالب پیالہ اور جو کچھ کہ اُس میں خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے اُن کو گوارا ہو جیو ؛

عَلَيْهِمْ سَلَامُ اللّٰهِ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ
بِمَقْتَلِ زَوْرَاءَ إِلٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ

ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زوراکی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو۔

وَلَيْتَ صُمَاخِيْ صُمَّ قَبْلَ اسْتِمَاعِهٖ
بِهَتْكِ اَسَاتِيْرِ الْمَحَارِمِ فِي الْاَسْرِ

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہو جاتے ؞

كَاَنَّ صَبَاحَ الْاَسْرِ يَوْمُ قِيَامَةٍ
عَلٰى اُمَمٍ شُعْثٍ تُسَاقُ اِلَى الْحَشْرِ

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا۔ کہ اُمّتیں سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر کی طرف ہکائی جاتی تھیں ؞

وَمُسْتَصْرِخٍ يَا لَلْمُرُوَّةِ فَانْصُرُوْا
وَمَنْ يَّصْرِخِ الْعُصْفُوْرَ بَيْنَ يَدَيْ صَقْرٍ

بہت لوگ فریاد کرتے تھے کہ دہائی ہے مروّت کی کوئی مدد کرو۔ مگر باز کے پنجے میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے ؞

يُسَاقُوْنَ سَوْقَ الْمَعْزِ فِيْ كَبِدِ الْفَلَا
عَزَائِزَ قَوْمٍ لَّا يَعُوْدُوْنَ بِالزَّجْرِ

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کے عادی نہ تھے اُن کے حرم محترم صحرا میں بکریوں کی طرح ہکائے جاتے تھے ؞

جُلِيْنَ سَبَايَا سَافِرَاتٍ وُّجُوْهُهَا
كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حُلَلِ الْخِدْرِ

جو لڑکیاں پردہ میں چادروں سے چہرے باہر نہ نکالتی تھیں اُن کو کھلے مُنہ اسیر کر کے لے گئے ؞

تَقُوْمُ وَتُخْفُوْا فِي الْمَعَاجِرِ وَاللِّوٰى
وَهَلْ يَخْتَفِيْ مَشْيُ النَّوَاعِمِ فِي الْوَعْرِ

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور ٹیلوں کے ڈھلانوں میں مُنہ چھپاتی ہیں مگر اُن کٹھن رستوں میں نازنینوں کی چال کب چھپ سکتی ہے ؞

لَقَدْ كَانَ فِكْرِيْ قَبْلَ ذٰلِكَ مَا تَرٰى
فَاَحْدَثَ اَمْرٌ لَّا يُحِيْطُ بِهٖ فِكْرِيْ

اِس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تو جانتا ہے مگر ایک ایسا امرِ عظیم حادث ہُوا جو میرے فکر کے احاطہ سے باہر ہے ؛

وَبَيْنَ يَدَيْ صَرْفِ الزَّمَانِ وَحُكْمِهٖ
مُغَلَّلَةٌ اَيْدِي الْقَيَاصِرِ وَالْحِبْرِ

زمانہ کی گردش اور حکومت کے سامنے شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ؛

نَعُوْذُ بِعَفْوِ اللّٰهِ مِنْ نَارِ فِتْنَةٍ
تَاَجَّجَ مِنْ قُطْرِ الْبِلَادِ اِلَى الْقُطْرِ

خدا کی پناہ ہے فتنہ کی اُس آگ سے جو دُنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب تک بھڑکتی چلی گئی ؛

بَدَا وَتَعَالٰى مِنْ خُرَاسَانَ قَسْطَلٌ
فَعَادَ رُكَامًا لَّا يَزُوْلُ عَنِ الْبَدْرِ

خُراسان سے ایک غبار نمودار ہو کر بلند ہوا اور ایک گھنگھور گھٹا بن گئی جو چاند پر سے ہٹنے والی نہ تھی ؛

رَعَى اللّٰهُ اِنْسَانًا تَيَقَّظَ بَعْدَهُمْ
لِاَنَّ مُصَابَ الزَّيْدِ مُزْجِرَةُ الْعَمْرٖو

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولت بنی عباس کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے ؛

وَسَائِرُ مُلْكٍ يَقْتَضِيْهِ زَوَالُهٗ
سِوٰى مَلَكُوْتِ الْقَائِمِ الصَّمَدِ الْوِتْرِ

خدائے بے نیاز و یگانہ کے مُلک کے سوا ہر مُلک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا زوال لگا ہوا ہے ؛

إِذَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ النَّاسَ بِالنَّظَرِ الشَّزْرِ

جبکہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق نہ رہیگا تو لوگوں کو تکبّر کی نگاہ سے مت دیکھ ؞

وَجَارِيَةُ الدُّنْيَا نَعُومَةُ كَفِّهَا
مُحْسِنَةٌ الْكِنَّهَا الْقَلْبُ ذُو الظُّفْرِ

کتّے کی طرح معشوقۂ دنیا کی ہتیلیاں تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اُس کے ناخن تیز ہیں ؞

وَلَوْ أَنَّ ذَا مَالٍ مِنَ الْمَوْتِ خَالِيًا
لَكَانَ جَدِيرًا بِالتَّعَاظُمِ وَالْكِبْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا تو البتہ بڑائی اور تکبّر کرنے کا مستحق تھا ؞

رَبِحْتَ الْهُدٰى إِنْ كُنْتَ عَامِلَ صَالِحٍ
وَإِنْ لَمْ تَكُنْ وَالْعَصْرِ إِنَّكَ لَفِي خُسْرٍ

اگر تُو نے نیک عمل کئے تو ہدایت کا نفع اُٹھا لیا ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹے میں رہا ؞

عَلَى الْمَرْءِ عَارٌ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدَهُ
وَإِنَّكَ يَا مَغْرُورُ تَجْمَعُ لِلْفَخْرِ

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی کے لئے ننگ کی بات ہے مگر اے غافل تو اُلٹا فخر کے لئے مال جمع کرتا ہے ؞

عَفَا اللهُ عَنَّا مَا مَضٰى مِنْ جَرِيمَةٍ
وَمَنَّ عَلَيْنَا بِالْجَمِيلِ مِنَ السَّتْرِ

خدا تعالےٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر ہم پر احسان کرے ؞

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے قویٰ کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کئے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصّہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس ۱۲۰ برس کے قریب عُمر پائی۔

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کئے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتّفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لئے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدّس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی۔

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنّن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشیع کا گمان کیا گیا ہے اس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعی لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے۔ ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے بڑی بات یہ ہے۔ کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک

وہ صوفی تھا۔ مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف۔ کھلاڈولا۔ یار باش ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا و نمائش سے دُور سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدّس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر۔ رشید۔ خاقانی۔ اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کو بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا باایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا۔ اور جو کوئی عقیدت یا محبّت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اِس لئے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا۔ کہ اکثر اُس کی سفارش سے جیسا کہ گلستان کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔ خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیرخواہی اور ہمدردی خدا تعالےٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اِس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے

لئے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر نہ چوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جوہر فطری دوسرے زمانے کے ایسے اتّفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیّت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتّفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسبِ کمال کی ترغیب ہونی چاہئے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقّی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسہ میں وہ حُسنِ اتّفاق سے تحصیل کے لئے پُہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سر برآوردہ تھا۔ اور جس دارالخلافتہ میں وہ مدرسہ واقع تھا۔ وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دُنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذّب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانہ نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عُمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دُور دراز سفر کرنے اور دُنیا کی عجائبات اور قُدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور مُلکوں کے متواتر تغیّرات۔ ظالم بادشاہوں اور بیرحم عالموں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے ایک بار جیسا کہ گلستان میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہُوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے

لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجہ کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے [91] برس بسر کئے تھے۔ عجیب و غریب تماشے اِس کی نظر سے گذر گئے۔ سلاطین کردیہ کا خاندان جن کی سعادت و جلالت۔ ایشیا افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی اِسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ۔ تونیہ۔ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا۔ اِسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت بحیرہ خزر اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِسی صدی میں تاتاریوں[۱] کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اِسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خُون مُغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اِسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اِسی صدی میں زوال آیا۔ دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اِسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت

۱؎ اِس معرکہ میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے دیباچہ میں لکھا ہے تاتاریوں نے صرف رے اور اُس کے گرد و نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کئے تھے۔ اور خراسان کے چار شہر۔ بلخ۔ مرو۔ ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہو گئے۔ اور اُن کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں ؛

زور و شور کے ساتھ حکمران رہا۔ ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اِسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقایع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے اُس میں کہتا ہے ؎

رَعَی اللهُ اِنسَانًا تَیَقَّظَ بَعدَ ھُم		لِاَنَّ مُصَابَ الزَّیدِ مِن جَرۃِ العَمرٖو

یعنی خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے۔ یورپ کے مشہور مصنف ہک مل صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرمجوش اور دلسوز اُستاد تھے۔

اِس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسّر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسّر آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالہ[1] میں اُس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ عالم سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما۔ صلحا۔ مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بوستان میں لکھتا ہے ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم		ز ہر خرمنے خوشہ یافتم	

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بلاد اسلام میں ایک جم غفیر اعلیٰ درجہ کے مشائخ اور علماء و حکماء کا نظر آتا تھا۔

[1] یہ رسالہ شیخ کی کلیات میں شامل ہے ۔

خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمدورفت رہی ہے جیسے ایران۔ روم۔ شام عراق عرب اور مصر وغیرہ وہ اب بھی دینی اور دُنیوی علوم کے مرکز تھے ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا۔ ان میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقّق ایسے موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں۔ اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدّین ابن العربی۔ خواجہ نصیرالدین طوسی۔ شیخ صدرالدین قونوی۔ مولانا جلال الدین رومی۔ ابن تیمیہ حرانی۔ امام یافعی۔ شیخ ابوالحسن شاذلی۔ شیخ تاج الدین قسطلانی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ ابن فارض۔ شیخ اوحدالدین کرمانی۔ قاضی ابن خلکان۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح۔ خواجہ علاء الدین سمنانی۔ علاّمہ قطب الدّین شیرازی۔ امام محی الدّین نودی۔ قاضی ناصرالدّین بیضادی ابن عساکر فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے سینکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گذرے تھے اور اِن کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے وہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور اُن کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا۔ جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اُسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا۔ اور کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش والواط کے جلسوں کا تماشائی تھا۔ نہ اُس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا۔ نہ بُت خانہ میں رہنے سے ننگ تھا۔ اسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا۔ اور وہی بُت خانہ سومنات

مَیں ایک مدت تک پوجاری رہا۔ کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا۔ غرضکہ اُس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنّفوں نے اس کو گریٹ مورلسٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اِس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھچ سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعرائے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہرا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ اس نے ایک سو بیس (۱۲۰) برس اس قفس عنصری میں بسر کئے ہیں۔ اگرچہ ہر علم وفن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ عمر پانی ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لئے سب سے زیادہ اِس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بُڈھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ شیخوخت کے مرتبہ کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رُکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ اُن کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی مگر اُن کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عُرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے غنچہ استعدادش ناشگفتہ ماند۔" ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک الھڑ بچھیرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست وخیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے۔ اور ایک معمّر سن رسیدہ شاعر گو اُس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اُس شائستہ اور سدھے منی

گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اُٹھاتا الغرض شاعری کے لئے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں۔ وہ سب خدائے تعالےٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔

شاعری کی بُنیاد چار چیزوں پر ہے۔ ایک؎ یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ محض اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے؎ وہ ایسے خیالات ہوں جن میں خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالاپن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے؎ یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کئے جائیں۔ کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔ چوتھے؎ شاعر کے دل میں جبکہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے۔ کم و بیش اُس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہئے۔ ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پُوری پائی جاتی ہیں۔ ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیّتیں موجود ہیں۔ لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے۔ جیسے خواجہ حافظ شیراز کی غزل۔ اِس لئے ہم اُن کو شیخ کا ہم پلّہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعرا پر اِس سبب سے بہت بڑی فوقیت ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں مسلّم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلّم الثبوت شعرا گذرے ہیں۔ اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کی نثر کو مثل نظم کے

جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندوستان میں نورالدین ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں۔ لیکن اہل ایران اُس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بیشک اُس کی نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں نہایت دلفریب ہیں جیسے ؎

سُنبل حرفش از آہ ناشکیبان		نبفشہ نقطہ اش از حالِ دلفریبان

از رشح طراوت کلمات نہر سطر مالال آبِ حیات خضر تشنہ لب سیرابی ادا مسیحا مُردہ جان بخشی ہوا نکنہ ہائے برجستہ غُنچہ ہا سربستہ۔ نثرش نثرہ رفعت۔ شعرش شعری مرتبت ہر صفحہ چمنے و ہر سطرے نخلے برگش لفظ دلکش و بارش معنی بے غش ہر حرفش فصلے و ہر فرعش اصلے"۔ اسی طرح سے نثر کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ؎

خوب اند و خوش اند و بو ندارند

بخلاف اِس کے شیخ نے گلستان میں اِس سے بہت زیادہ دلاویز و دلکش الفاظ میں حقایق واقعیہ کو بیان کیا ہے۔ یہ بات گلستان کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔ مثلاً "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی۔ نظرے داشتم بہ روے و گزرے داشتم بہ کوئے۔ ۲۔ اے برادرم حرم در پیش و حرامیاں از پس اگر رفتی بردی و اگر خفتی مردی۔ ۳۔ آزردن دل دوستان جہل ست و کفارۂ یمین سہل۔ ۴۔ تو کہ چراغ نہ بینی بچراغ چہ بینی۔ ۵۔ طریق درویشان ذکر ست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکّل و تسلیم و تحمّل۔ ہر کہ بدین صفتہا موصوف است بحقیقت درویش ست۔ اگرچہ در قباحت۔ اما ہرزہ گردے

بے نمازے ہواپرستے ہوس بازے کہ روز ہا بہ شب آرد و در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب غفلت و نخورد ہرچہ درمیان آید و بگوید انچہ بر زبان آید زندیق ست اگرچہ در عبادت ست۔ ۶۔ پدر را عسل بسیار است اما پسر گرمی دار است۔ ۷۔ صیّاد بے روزی در دجلہ ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد۔ ۸۔ گوئی خردۂ مینا بر خاکش ریختہ و عقدِ ثریا از تاکش در آویختہ۔ ۹۔ عصارۂ تاکے بقدرتیش شہد فایق شدہ و تخم خُرما بہ مین تربیتیش نخل باسق گشتہ۔"

نظم ونثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادر الوجود نہیں ہیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال ہے۔ انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقّی انتہا کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ صرف گنتی کے آدمی ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیّت حاصل ہوئی ہے بعضے ملٹن کو اور بعضے سکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم ونثر کا جامع خیال کرتے ہیں۔ پس شیخ کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے۔ کہ ایران میں صرف اُسی کی نظم و نثر ایسی ہیں۔ جن کو تمام اہل زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تغزل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعرائے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رُخوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اسی بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر امرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے۔ فارسی زبان میں اور اُس کی پیروی سے اُردو زبان میں بھی ہمیشہ شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت۔ رند ہو یا صُوفی خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا

مرد کا عاشق ہو یا عورت کا بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے۔ اور وہ اور اُس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔ دُنیادار ہو یا تارکِ دُنیا۔ عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے۔ جس سے ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے۔ اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رُخ لڑکے پر مفتون ہیں۔ اور اُن کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جُدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بے قرار ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقتِ واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بُو سونگھی صدہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاکباز اور صاحب عفّت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں۔ البتہ

اِس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے۔ جس کے اصول اور فروع سب تصنّع اور بناوٹ اور ادعائے پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولینا روم اور امیر خسرو اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوّفین اِس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرایہ میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعیہ بیان کرتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ اِن لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال وخط اور شراب وشاہد کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہد حقیقی کے شیون وصفات مراد لینی صرف ایک ملّایانہ گھڑت ہے۔ جس میں سراسر تکلّف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کُوچہ شاعری سے نابلد ہیں۔ کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں ؎

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران	گفتہ آید در حدیث دیگران

شعرائے متصوّفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کئے جائیں تو اُن میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دِل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمدؐ شیرین جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے اُن کے سامنے کسی نے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا ؎

چشمم اگر این است وابرو این وناز وعشوہ این	الوداع اے زہد وتقویٰ الفراق اے عقل ودین

مولانا نے سُن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضرور ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محل نہ رکھتا ہو

شیخ نے بھی یہ بات سُنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مرادف لفظ ہیں پس عین سے ذات الٰہی مراد لی جا سکتی ہے اور ابرو حاجب کا مرادف ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفات الٰہی جو کہ حاجبِ ذات ہیں مراد لی جائیں مولانا نے اِس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی" خواجہ حافظ کی نسبت اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ "یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اُس نے اکثر اسرار غیبی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کئے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا" پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوان حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی کے تتبع سے حاصل کیا ہے۔

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُنہوں نے تغزل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب اور کامجو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت انسانی بالکل ابا کرتی ہے ہمارے نزدیک اِس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے۔ اِس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں لائی جاتی ہیں پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے

اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق
ومعشوق دونوں مرد فرض کئے جاتے ہیں۔ مَیں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے
دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شُبہ باقی
رہ جاتا ہے۔ اِس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے
نکل کر اطراف وجوانب میں پھیلے تو بسبب اِس کے کہ اِن کے ہاں عورتوں کا مردوں سے
چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا۔ غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں
اُن کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اِس غیرت کا
ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس
عالمگیر کے ساتھ رہا اپنے وقائع میں لکھتا ہے "ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا
تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفس اگرچہ کیسا ہی ذی رتبہ اور صاحب اعتبار ہو
نہیں جانے پاتا تھا ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بیرحمی کے
ساتھ پٹتا تھا۔ اور ایران میں سُنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے
فرسنگ کے فاصلہ پر نظر پڑ جاتا تھا۔ تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا
گانوں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد وعورت اپنے اپنے مقام اور مسکن
چھوڑ کر چلے جاتے تھے"۔ شاید اِس بیان میں کچھ مبالغہ ہو مگر اِس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے
کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔
چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مداح اور مصاحب ہوتے تھے اِس لئے وہ کوئی بات
سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت
قوّی گمان ہے کہ شعرا نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حُسن وجمال کا ذکر اور جو

معاملاتِ عشق کے زمانہ میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں اُن کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی حمیت اور غیرت کے برخلاف سمجھا ہوا ور اِس لئے تمام عشقیہ مضامین امردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گذرا ہے وہ اِس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی غزل گا رہا تھا۔ اور بادشاہ اُس کو سُن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب	کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ وفعتہً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اِس قدر برہم ہُوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً مُلّا نقشی مہرکن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بُلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا حضور خیر باشد۔ بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ مُلّا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصّہ فرو کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا اس لئے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق اشعار کہتے تھے یہ شعر بھی انہوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تُو رات کو کسی عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا۔ اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیساکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُن کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ گلستان کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبّت اُس کی سرشت میں تھا۔ اور کسی نہ کسی وقت میں اُس کو سادہ رُخوں اور امردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اِس بات کو میں کسی بُری معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو نفحات وغیرہ میں لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لئے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقّی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفا میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفّت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے۔ اسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی براءت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے ؎

گر نظرِ صدق را نام گنہ مے نہند	حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

تمام شد

(شیخ مبارک علی بکسیلر اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شایع کیا)

